ماہنامہ

میثاق

لاہور

جون ۷۹ء

اشاعت خصوصی بسلسلہ چھٹی سالانہ

قرآن کانفرنس

منعقدہ کراچی : ۲۲ تا ۲۵ مارچ ۷۹ء

زیر اہتمام

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

صدر مؤسس

ڈاکٹر اسرار احمد

اس شمارے کی قیمت ——— فی پرچہ ۔/۔

عرض احوال

مئی اور جون کا مشترک شمارہ بھی تاخیر کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ باعث تاخیر یہ کہ مئی کے وسط میں راقم الحروف پر ایک شدید علالت کا حملہ ہوا جس کے اثرات ڈھائی تین ہفتے تک رہے۔ راقم کی مصروفیات میں سے درس و خطاب کے ضمن میں تو چونکہ یہ احساس ہوتا ہے کہ پروگرام پہلے سے طے ہوتا ہے اور لوگ دور دور سے آتے ہیں لہٰذا جونہی ہمت ہوتی ہے اس کا سلسلہ فوراً شروع ہو جاتا ہے لیکن ''لزلہ بر عضوضعیف می افتد'' کے مصداق 'میثاق' زیادہ متاثر ہو جاتا ہے!

چھٹی سالانہ قرآن کانفرنس میں، جس کے بعض مقالے اس اشاعت میں شائع ہو رہے ہیں، راقم نے ''اسلام کا معاشی نظام'' کے موضوع پر مفصل خطاب کیا تھا۔ خیال تھا کہ اسے مرتب کر کے اس اشاعت میں شامل کر دیا جائے گا۔ لیکن یہ ارادہ بھی اسی بنا پر پورا نہ ہو سکا۔

البتہ راقم کی آج سے تقریباً پانچ سال کی ایک تحریر اس شمارے میں دوبارہ شائع ہو رہی ہے، دراصل اس کی کتابت راقم کی زیر طبع کتاب ''سراگندیم'' میں شامل کرنے کے لیے کرائی گئی تھی۔ خیال آیا کہ کتابی شکل میں اشاعت میں تو ابھی وقت لگ جائے گا، قارئین 'میثاق' کی خدمت میں یہ پہلے ہی کیوں نہ پیش کر دی جائے۔ 'میثاق' کے موجودہ قارئین میں ایک بڑی تعداد ایسے حضرات کی ہے جو ۷۵ء کے بعد اس حلقے میں شامل ہوئے ہیں۔ ان کے لیے تو یہ تحریر نئی ہی ہوگی۔ پرانے حضرات بھی ان شاء اللہ اس میں قند مکرر کا لطف پائیں گے۔

''اسلام کی نشأۃ ثانیہ'' کے ضمن میں جو شور و غوغا اس وقت بعض ممالک میں پایا جاتا ہے ہماری دانست میں وہ حقیقی اور واقعی سے زیادہ سطحی اور نمائشی ہے۔ اور صورت واقعہ کے اعتبار سے ہمارے نزدیک حالت اب بھی لگ بھگ وہی ہے جو ۷۵ء میں تھی، گویا

نہ وہ بدلے، نہ دل بدلا، نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیسے اعتبار انقلاب آسماں کر لوں!

خاکسار — اسرار احمد

(نوٹ: فہرست مضامین کور کے آخری صفحے پر ملاحظہ فرمائیں!)

اُمّتِ مُسلمہ کا عروج و زوال

اور موجودہ احیائی مساعی کا اجمالی جائزہ

از

اسرار احمد

ہمارے نزدیک بیسویں صدی عیسوی کو اُمّتِ مسلمہ کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ (TURNING POINT) کی حیثیت حاصل ہے، چنانچہ اس کے ربع اوّل کے خاتمے کے لگ بھگ جبکہ اُمّت کے ایک حساس اور دردمند فرد کی دل کی گہرائیوں سے یہ دردانگیز صدا بلند ہوئی ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!! (حالی)

تاریخ ایک کروٹ لے چکی تھی اور ملّتِ اسلامی کے تنِ مُردہ میں حیاتِ تازہ کے کچھ آثار ظاہر ہونے شروع ہو چکے تھے۔

اور اگر ذرا بنظرِ غائر مشاہدہ کیا جائے تو اس صدی کا درمیانی نصف تو ایک نہایت ہی عجیب نقشہ پیش کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ ایک طرف تنزّل اور انحطاط کا عمل بھی جاری رہا اور نکبت و ادبار کے سائے مزید گہرے ہوتے چلے گئے جس کا نقطۂ عروج (CLIMAX) ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۱ء کی ذلّت و رسوائی ہے اور دوسری طرف ایک گھمبیر اور ہمہ جہتی احیائی عمل کا آغاز بھی ہو گیا جس کا نقطۂ آغاز ۱۹۲۵ء کا زمانہ ہے۔

گویا مسلسل پچاس تک یہ دونوں "مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ"[1] کی سی شان کے ساتھ پہلو بہ پہلو جاری رہے۔

اس اجمال کی تفصیل کے ضمن میں ہم پہلے اُمّتِ مسلمہ کے عروج و زوال کا ایک اجمالی خاکہ تاریخی ترتیب (CHRONOLOGICAL ORDER) کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ ایک طرف 'عروج' کے ضمن میں ملّتِ اسلامی کی عظمت و سطوت گزشتہ کی ایک جھلک سامنے آئے اور علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق کہ ؎

"کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر بھی کیا تو نے ؟
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا!"

مسلمان نوجوان کو معلوم ہو کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب عرب افواج جبرالٹر سے شمال مشرق کی جانب بڑھتی ہوئی فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی تھیں اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب ترک افواج پورے مشرقی یورپ کو روندتی ہوئی اٹلی کے دروازوں تک جا پہنچی تھیں، شاید کہ اسی طرح کچھ نوجوانوں کے دل میں ملّت اسلامی کی تجدید اور اس کی عظمت و سطوتِ گزشتہ کی بازیافت کا جذبہ پیدا ہو جائے ؟ —— اور دوسری طرف 'زوال' کے ضمن میں یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ خدا کا عدل بے لاگ ہے اور اس کا قانون اٹل اور غیر مبدّل، اس نے جو معاملہ سابق اُمّتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کے ساتھ کیا بعینہٖ وہی ہمارے ساتھ کیا۔ حتیٰ کہ ہماری اور ان کی تاریخ میں ایک حد درجہ حیرت انگیز مشابہت موجود ہے اس پہلو سے کہ یہود پر بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کے دو دور آئے اور ہم پر بھی دو ہی دور آئے۔ اگرچہ اُمّت محمّد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی وسعت

---

[1] سورۂ رحمٰن، آیات ۱۹ و ۲۰ "چلائے دو دریا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ (لیکن) دونوں کے مابین ایک پردہ (حائل) ہے کہ باہم ایک دوسرے پر غالب نہ آسکیں!"

کی نسبت سے ہمارے نکبت و ادبار کے یہ دور بھی یہود کے مقابلے میں بہت طویل رہے اور جس طرح بنی اسرائیل کی تولیت کے زمانے میں بیت المقدس کے ناموس کا پردہ ـــ

''اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں   سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک!''

کے مصداق دو بار چاک ہوا اسی طرح ہمارے عہدِ تولیت میں بھی مسجد اقصیٰ کی حرمت دو ہی مرتبہ پامال ہوئی۔

اس کے بعد ہم اس گھمبیر اور ہمہ جہتی ''احیائی عمل'' کا اجمالاً جائزہ لیں گے تاکہ ایک طرف لوگوں کا اُفقِ ذہنی وسیع ہو اور وہ مختلف احیائی کوششوں کو ان کے صحیح پس منظر (PERSPECTIVE) میں دیکھ سکیں اور دوسری طرف یہ بھی واضح ہو جائے کہ ہم خود اس ہمہ جہتی احیائی عمل کے کس گوشے میں ایک حقیر سی خدمت سرانجام دینے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ '' لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ''[1] کے مصداق جو ہمارا ساتھ دینا چاہے وہ بھی پورے انشراحِ صدر کے ساتھ دے اور جو تنقید کی 'خدمت' سرانجام دینا چاہے وہ بھی ہمارے مؤقف کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد اس اہم مگر نازک فرض کی ادائیگی پر کمربستہ ہو!

(۱)

اُمتِ مسلمہ کے عروج و زوال کے تاریخی خاکے کے ضمن میں دو باتیں پیشگی سمجھ لینی چاہئیں :۔

ایک[1] یہ کہ اپنی ہیئتِ تشکیلی کے اعتبار سے اُمتِ محمدؐ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دو حصے ہیں ۔ پہلا ''اُمیّین'' یعنی بنی اسمٰعیل پر مشتمل ہے اور اسے اس اُمت کے قلب یا مرکز (NUCLEUS) کی حیثیت حاصل ہے

---

[1] سورۃ انفال آیت ۴۲ : ''تاکہ ہلاک ہو جسے ہلاک ہونا ہے حجت قائم ہو چکنے کے بعد اور جیئے جسے جینا ہو واضح دلیل کے ساتھ!''

اور دوسرا "آخَرِینَ" یعنی دیگر اقوام پر مشتمل ہے خواہ وہ کُرد ہوں یا ترک، اہل فارس ہوں یا اہل ہند، افغان ہوں یا مغل، اہل حبش ہوں یا بربر، شرق بعید یعنی ملایا اور انڈونیشیا سے تعلق رکھتے ہوں یا مغرب بعید یعنی مراکو اور موریطانیہ سے۔

دوسرے یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے بھی عالم اسلام کو تین حصّوں میں منقسم سمجھنا چاہیئے۔ یعنی ایک قلب، دوسرے میمنہ اور تیسرے میسرہ، اگر دنیا کے نقشے کو سامنے رکھ کر عالم اسلام پر نگاہ جمائی جائے تو وہ ایک ایسے عقاب کے مانند نظر آئے گا جو اپنے دونوں بازوؤں کو پوری طرح پھیلائے محو پرواز ہو۔ جزیرہ نمائے عرب، عراق، فلسطین، شام اور ایشیائے کوچک جو عالم اسلام کے قلب کی حیثیت رکھتے ہیں اس عقاب کے جسم کے مانند نظر آئیں گے جن میں سے ایشیائے کوچک کو اس کے سر اور چونچ سے مشابہت ہے اور جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصّے کو اس کے دم کے پھیلے ہوئے پروں سے اس عقاب کا دایاں بازو (میمنہ) ایران، ترکستان، افغانستان اور برصغیر ہندوپاک سے ہوتا ہُوا ملایا اور انڈونیشیا تک پھیلا ہُوا ہے اور بایاں بازو (میسرہ) پورے شمالی افریقہ کو لپیٹ میں لیتا ہُوا سپین تک چلا گیا ہے۔

اب آئیے تاریخی خاکے کی طرف :-

سن عیسوی[1] کے حساب سے اُمّت مسلمہ کی تاریخ کا آغاز ساتویں صدی سے ہوتا ہے اس لئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی ولادت باسعادت اغلباً ۵۷۱ء میں ہوئی۔ ۶۱۰ء میں آپؐ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا اور محتاط ترین حساب کے مطابق اپریل ۶۳۲ء میں آپ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک 'اسلامی انقلاب' کی تکمیل فرما کر "رفیق اعلےٰ" سے جا ملے، فصلّی اللہ علیہ وبارک

---

[1] چونکہ اکثر لوگوں کے اذہان سن عیسوی ہی کے ساتھ زیادہ مانوس ہیں، لہذا یہاں اسی کو پیش نظر رکھا جا رہا ہے!

وسلّم تسلیماً کثیراً - اصحاب ثلاثہ یعنی حضراتِ ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عہدِ خلافت کے دوران "امّیین" ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلوار لے کر ایک سیلاب کے مانند جزیرہ نمائے عرب سے نکلے اور انہوں نے ایک ربع صدی سے بھی کم میں ایران و عراق، شام و فلسطین اور مصر کے علاوہ شمالی افریقہ کے بڑے رقبے پر اسلام کا پرچم لہرا دیا - حضرت علی رضی اللہ عنہ، کے عہدِ خلافت میں تو یہ عمل رکا رہا لیکن بنوامیّہ کے دور کے آغاز کے ساتھ ہی اس سیلاب نے دوبارہ آگے بڑھنا شروع کر دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ایک طرف مشرق میں ترکستان، افغانستان اور سندھ تک اور دوسری طرف مغرب میں پورے شمالی افریقہ کے علاوہ سپین سمیت مغربی یورپ کا وسیع علاقہ "امّیین" کے زیرِ نگیں آ گیا اور عالمِ اسلام کی سرحدیں تین برّاعظموں تک وسیع ہو گئیں - یہی وہ زمانہ تھا جب عرب افواج اندلس سے پیش قدمی کرتے ہوئے فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی تھیں -

آٹھویں، نویں اور دسویں صدی عیسوی کا زمانہ عربوں کے عروج کا دور ہے، جس کے دوران اسلام کی علمبرداری اور عالمِ اسلام کی سیادت دونوں "امّیین" کی دو اہم شاخوں یعنی بنوامیّہ اور بنوعباس کے پاس رہیں[1] اور رہے

---

[1] ان میں سے بھی صرف بنوامیّہ کے دورِ حکومت کو خالص عرب غلبہ و اقتدار کا دور قرار دیا جا سکتا ہے - اس لئے کہ بنوعباس کے دورِ حکومت میں ابتدا ہی سے اہلِ عجم کو حکومت و سلطنت کے معاملات میں فیصلہ کن دخل حاصل ہو گیا تھا اور در اصل اسی نے عرب اقتدار کے تناور درخت کو اندر ہی اندر گھن کی طرح چٹ کر لیا ورنہ خالص عرب خون میں جو حرارت تھی اور قوتِ مقاومت موجود تھی اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ بنوامیّہ کی ایک شاخ جس نے اندلس میں قدم جمائے وہ عالمِ اسلام کے قلب سے عرب قوت کے کلی خاتمے کے بھی تین صدی بعد تک پھلتی پھولتی رہی اور اس کا خاتمہ کہیں پندرھویں صدی عیسوی میں جا کر ہوا -

ارضی کے ایک بڑے حصے پر اُن کے دین و مذہب، ان کے تہذیب تمدن، ان کے علوم و فنون اور ان کی شان و شوکت کا سکّہ رواں رہا۔ لیکن جیسے جیسے دنیوی جاہ و جلال میں اضافہ ہوا، جذباتِ دینی اور حرارت ایمان میں کمی آتی چلی گئی اور اس طرح یہ تناور درخت اندر سے کھوکھلا ہوتا چلا گیا، اس اندرونی اضمحلال کے اثرات کے ظاہر ہونے میں کچھ مدّت ضرور صرف ہوئی لیکن دسویں صدی عیسوی ہی کے دوران واضح ہو گیا تھا کہ عرب اپنے عالمِ پیری میں قدم رکھ چکے ہیں۔

گیارھویں صدی عیسوی کے دوران "اُمیّین" کا انحطاط اور زوال اپنی آخری حدوں کو پہنچ گیا اور اس طرح عالم اسلام کے قلب میں قوّت کا ایک خلا (POWER VACUUM) پیدا ہو گیا۔

خوش قسمتی سے قوّت کے دباؤ میں اس کمی (DEPRESSION) کے نتیجے میں عالم اسلام کی شمال مشرقی سرحدوں سے جو قبائل قلب اسلام کی طرف کھنچ کر آئے وہ پہلے ہی سے مُسلمان ہو چکے تھے۔ یعنی کُرد اور ترکانِ سلجوقی جنہوں نے گیارھویں صدی عیسوی کے دوران شام، فلسطین اور مصر میں مضبوطی کے ساتھ قدم جمائے اور اس طرح عالم اسلام کے قلب کی حفاظت اور مدافعت کے لئے کسی قدر تازہ دم قوّت فراہم ہو گئی[1]

بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی کے دوران میں اُمّت مسلمہ پر گویا عذابِ خداوندی کے "وعدہ اولیٰ کا ظہور ہوا اور ہوبہو بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ[2]" کا نقشہ کھنچ گیا۔

---

[1] یہ اسی دور کی بات ہے کہ افغان قبائل نے جنوب مشرق کا رُخ کیا اور ہندوستان پر حملے شروع کئے جس سے ہند میں مسلمانوں کی عظیم الشان مملکت کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔

[2] سُورہ بنی اسرائیل آیت ۵ "بھیجے ہم نے تم پر اپنے بندے سخت جنگجو، جو گھس گئے اور پھیل گئے شہروں کے مابین!"

چنانچہ پہلے مغرب سے صلیبی طوفان کے ریلے آنے شروع ہوئے اور ۱۰۹۹ء میں نہ صرف یہ کہ مسجد اقصیٰ کے ناموس کا پردہ چاک ہوا بلکہ بیت المقدس میں وہ قتل عام ہوا۔ جس کا تذکرہ کرتے ہوئے مغربی مورخین بھی کانپ جاتے ہیں۔ پورے اٹھاسی برس تک بیت المقدس پر صلیبیوں کا قبضہ رہا اس لئے کہ دولت عباسی تو "مرنے والی اُمتوں کے عالم پیری" کا نقشہ پیش کر رہی تھی گویا اُمتیں میں تو سرے سے دم خم باقی ہی نہ رہا تھا بالآخر 'آخرین' کے تازہ و گرم خون نے مجاہد کبیر صلاح الدین ایوبیؒ کی سرکردگی میں ۱۱۸۷ء میں بیت المقدس کو صلیبیوں کے قبضے سے نجات دلائی اور اس طوفان کا رُخ موڑا۔

——— اور پھر مشرق کی جانب سے آیا فتنۂ تاتار کا وہ طوفان عظیم جس نے پہلے افغانستان اور ایران کو پامال کیا اور ہر جگہ کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور بالآخر ۱۲۵۸ء میں بغداد میں وہ تباہی مچائی کہ رہے نام اللہ کا۔ لاکھوں مسلمان تیغ ہوئے۔ بغداد کی گلیاں خون کی ندیاں بن گئیں اور الف لیلہ کے اس کے رومانوی شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور بعینہٖ وہ کیفیت پیدا ہوگئی جو کم و بیش دو ہزار سال قبل بخت نصر کے حملے سے بیت المقدس کی ہوئی تھی۔ نتیجۃً زوال ملک مستعصم امیر المومنین کے ساتھ ہی خلافت عباسی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بالکل گل ہوگیا اور نہ صرف یہ کہ اُمت مسلمہ پر عذاب خداوندی کا یہ پہلا دور تکمیل کو پہنچا بلکہ کم از کم 'اُمیین' کی حد تک تو "اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ"[1] کی وعید بھی پوری ہوگئی اور وہ عالم اسلام کی سیادت و قیادت کے منصب سے معزول کر دیئے گئے۔ دو سال بعد یعنی ۱۲۶۰ء میں اس طوفان کا رُخ بھی 'آخرین' ہی نے پھیرا جس سے کم از کم اسلام کا مغربی بازو اس کی تاخت و تاراج سے محفوظ رہ گیا۔

بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی کے دوران عالم اسلام کا قلب بعینہٖ

---

[1] سورہ فتح آیت ۳۸: "اگر تم پیٹھ موڑ لوگے تو اللہ، تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو کھڑا کر دے گا!"

وہی نقشہ پیش کر رہا تھا جسے دیکھ کر کبھی حضرت عزیر علیہ السلام کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے تھے کہ "اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا"[1] لیکن پھر اُمّت مسلمہ کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی وہی شان ظاہر ہوئی جس کا ظہور بنی اسرائیل کے حق میں ہوا تھا یعنی "ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا"[2] صرف اس فرق کے ساتھ کہ چونکہ سابقہ اُمّت مسلمہ ایک ہی نسل پر مشتمل تھی لہٰذا اس کی "نشاۃ ثانیہ" کا یہ عمل بھی لامحالہ اسی نسل کے اندر واقع ہوا لیکن اُمّت محمدؐ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے معاملے میں یہ مجبوری نہ تھی لہٰذا یہاں "تجدید ملّت" کا یہ کام "آخرین" کی مختلف اقوام سے لے لیا گیا۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ خود انہی ترکان چنگیزی کا بڑا حصّہ اسلام لے آیا[3] جن کے ہاتھوں عالم اسلام پر ہولناک تباہی آئی تھی بلکہ انہی کے قبیل کے وحشی قبائل میں سے دو قبیلوں کو یہ توفیق ارزانی ہوئی کہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور ان میں سے ایک یعنی ترکانِ تیموری نے ہندوستان میں ایک عظیم الشان مسلم سلطنت کی بنیاد رکھ کر عالم اسلام کے دائیں بازو کی توسیع کی اور دوسرے یعنی ترکان عثمانی نے ابتداءً ایشیائے کوچک میں قدم جمائے اور پھر رفتہ رفتہ اس عظیم الشان مسلمان مملکت کی بنیاد رکھی جس نے ایک طرف پورے مشرقی یورپ پر اپنی بالادستی کا سکّہ جمایا۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر اٹلی کے دروازوں تک پر دستک دی اور دوسری طرف شمالی افریقہ سمیت پورے عالم اسلام کے قلب کی حفاظت و سیادت کی ذمّہ داری سنبھالی تا آنکہ خلافت کا بھی احیاء کیا۔ اور اس طرح گویا عالم اسلام کے قلب کی عظمت و سطوتِ گزشتہ پھر پوری طرح لوٹ آئی۔ اگرچہ عربوں کے ذریعے نہیں بلکہ ترکوں

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ۲۵۹: "کیسے زندہ کرے گا اللہ اسے، اس کی موت کے بعد!"

[2] سورہ بنی اسرائیل آیت ۶: "پھر ہم نے تمہیں ان پر دوبارہ غلبہ عطا فرمایا اور تمہاری مدد کی مال و اسباب اور بیٹوں سے اور کر دی تمہاری نفری سب سے زیادہ!"

[3] ہے عیاں فتنہ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے! (اقبال)

کے واسطے سے!

قدرت کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ اِدھر تو خلافت عثمانی کے استحکام کے ذریعے عالم اسلام کے قلب میں گویا ملّت کی نشاۃ ثانیہ ہوئی اور اُدھر یورپی استعمار کے سیلاب کی صورت میں اُمّت مسلمہ پر عذاب الٰہی کے دوسرے اور نہایت طویل دور کا آغاز ہو گیا جس کا اصل زور عالم اسلام کے میسرہ اور میمنہ کی جانب رہا۔

یہ ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ یورپ میں احیاء (RENAISSENCE) کا پورا عمل اسلام ہی کے زیر اثر شروع ہوا اور یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے یورپ کو مشرق و مغرب کے علوم و فنون سے روشناس کرایا۔ لیکن جیسے ہی یورپ میں بیداری پیدا ہوئی اور وہاں قوّت کا دباؤ (POWER POTENTIAL) بڑھا۔ گویا عالم اسلام کی شامت آگئی۔

یورپ مشرق و مغرب دونوں اطراف سے مسلمانوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا (LOCKED) تھا۔ لیکن مشرق میں عذاب کے وعدۂ اُولیٰ کے بعد نشاۃ ثانیہ کا عمل ظاہر ہو چکا تھا اور عظیم سلطنت عثمانیہ عالم اسلام کے قلب کے محافظ سنتری کی حیثیت سے کھڑی تھی البتہ مغرب میں اب دولتِ ہسپانیہ "مرنے والی اُمّتوں کے عالم پیری" کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ لہٰذا "بے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات!" کے مصداق یورپی استعمار کا اوّلین شکار وہی بنی اور پندرھویں صدی عیسوی کے دوران اس عظیم سلطنت کا قلع قمع ہو گیا یہاں تک کہ ۱۴۹۲ء میں سقوط غرناطہ کے بعد تو بعینہٖ وہ صورت پیدا ہو گئی جس کا نقشہ قرآن مجید میں عذاب استیصال کا نوالہ بننے والی قوموں کے بیان میں کھینچا جاتا ہے۔ یعنی

"كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا!" اور "لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ!"

"جیسے کہ وہ کبھی وہاں آباد ہی نہ تھے، اور اب ان کے ویران مسکنوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا"!

۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما نے نیا بحری راستہ تلاش کیا اور اس کے فوراً

بعد یورپی استعمار کا سیلاب عالم اسلام کے میمنہ پر ٹوٹ پڑا اور انڈونیشیا، ملایا اور ہندوستان مختلف یوروپی اقوام کے استبدادی پنجوں میں جکڑے گئے اور یہ عمل جس کا آغاز سولہویں صدی عیسوی سے ہوا، اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں عالم اسلام کے دائیں بازو کی حد تک اپنے عروج (ZENITH) کو پہنچ گیا۔

اس اثنا میں دولت عثمانی بھی اپنے شباب کے دور سے گزر آئی تھی اور اب اس نے بھی 'مرد بیمار' کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ گویا عالم اسلام کے قلب میں آٹھ صدیوں کے بعد پھر وہی قوت کا خلا پیدا ہو گیا جو گیارھویں صدی عیسوی میں دولت عباسیہ کے اضمحلال کے باعث پیدا ہوا تھا۔ اور قوت کے دباؤ کی اس کمی کے باعث مغربی استعمار کا رُخ عالم اسلام کے قلب کی جانب مڑ گیا اور گویا اُس کے اعتبار سے بھی "وَعْدُ الْآخِرَةِ" کا وقت آ پہنچا۔

عالم اسلام کے قلب پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کے اس دوسرے دور کا آغاز بیسویں صدی کے شروع میں ہو گیا تھا چنانچہ پہلی عالمگیر جنگ کے خاتمے پر جب دنیا کا نیا نقشہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ عظیم دولت عثمانیہ سمٹ سمٹا کر ایشیائے کوچک میں محدود ہو گئی اور شمالی افریقہ سمیت پورا عالم عرب چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو کر مختلف یورپی اقوام کے براہ راست زیر نگیں ہو گیا یا بالواسطہ محکومی میں آ گیا اور ہو بہو وہی کیفیت پیدا ہو گئی جس کی خبر مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں دی تھی کہ "ایک زمانہ آئے گا کہ اقوام عالم ایک دوسرے کو تم پر ٹوٹ پڑنے کی اس طرح دعوت دیں گی جیسے کسی دعوتِ طعام کا اہتمام کرنے والا دسترخوان چنے جانے پر مہمانوں کو بلایا کرتا ہے!"

اس طرح بحیثیت مجموعی اُمت مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کے دورِ ثانی کی تکمیل اس صدی کے ربع اوّل میں ہو گئی تھی جبکہ پورا عالم اسلام مغربی استعمار کے ناپاک شکنجے میں جکڑا گیا۔ اگرچہ خاص "اُمّیین" کے حق میں "وَعْدُ الْآخِرَةِ" کی وہ مکمل صورت جو "لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ

اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّلِیُتَبِّرُوْا مَاعَلَوْا تَتْبِیْرًا[ا] کے الفاظ میں بیان ہوئی تھی تقریباً نصف صدی قبل[۲] ظاہر ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی ایک مغضوب و ملعون قوم کے ہاتھوں ایک شرمناک اور ذلّت آمیز شکست دلوائی اور عربوں کے عہدِ تولیت کے دوران ایک بار پھر مسجد اقصیٰ کی حرمت پامال ہوئی اور بیت المقدس ان کے ہاتھوں سے نکل کر یہود کے قبضے میں چلا گیا اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس بار یہ قبضہ کتنا طویل ہوگا!

اس داستان کا الم ناک ترین باب یہ ہے کہ مغربی استعمار نے اُمّتِ مسلمہ کی وحدتِ ملّی کو پارہ پارہ کر دیا اور اس صدی کے آغاز ہی میں نسلی اور علاقائی عصبیتوں کے وہ بیج مسلمان اقوام کے دلوں میں بو دیئے جو ابھی تک برگ و بار

[ا] سورۃ بنی اسرائیل آیت ۷: "تو پھر جب آیا وقت دوسرے وعدے کا (تو مسلّط کئے تم پر وہ لوگ) تاکہ حلیہ بگاڑ دیں تمہارا اور گھس جائیں مسجد (اقصیٰ) میں جیسے کہ گھسے تھے پہلی بار اور تباہ و برباد کر دیں جس پر بھی قابو پائیں!"

[۲] یہ ایک عجیب تاریخی حقیقت ہے کہ روئے ارضی کے دو قبلوں میں سے بے حرمتی اور پامالی کا معاملہ چاروں مرتبہ مسجد اقصیٰ ہی کے ساتھ ہُوا جسے غلطی سے قبلہ اوّل کہہ دیا جاتا ہے واضح رہنا چاہیئے کہ قبلۂ اوّل بیت اللہ اور مسجد حرام ہے (بفحوائے الفاظ قرآنی "اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ") اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو خاص معاملہ رہا ہے وہ واقعہ فیل سے ظاہر ہے اور راقم کو تو یہی حکمت نظر آتی ہے اس میں کہ مُسلمانوں کے سیاسی مرکز کو رفتہ رفتہ اس قبلۂ اوّل سے دُور سے دُور تر کیا جاتا رہا تاکہ اس اُمّت کو بھی جب عذاب الٰہی سے واسطہ پڑے تو اس کے ساتھ خانہ کعبہ کی حرمت بھی مجروح نہ ہو۔ چنانچہ خلافت راشدہ ہی کے اواخر میں مرکز عالم اسلام مدینہ منورہ سے کوفہ منتقل ہو گیا۔ پھر وہاں سے بھی دمشق اور بغداد کی جانب نقل مکانی ہوئی اور بالآخر انتہائی شمال یعنی قسطنطنیہ کو عالم اسلام کے 'دارالخلافہ' کی حیثیت حاصل ہو گئی اس طرح بیت اللہ کم از کم اغیار و اعداء کی دست بُرد سے ہمیشہ محفوظ رہا۔ (یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کے تقدّس پر دو ایک مرتبہ خود ان لوگوں کے ہاتھوں کسی قدر آنچ آئی جو اپنے آپ کو مُسلمان کہلواتے تھے!

لا رہے ہیں - چنانچہ پہلے انہوں نے عربوں کو ترکوں کے خلاف ابھارا - نتیجۃً عالم اسلام کا قلب دو لخت ہو گیا اور وحدتِ ملّی کے علامتی ادارے (SYMBOL) یعنی خلافت کا بھی خاتمہ ہو گیا - پھر عالم عرب کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اس طرح تقسیم کیا کہ نسلی اور لسانی اشتراک کے باوجود عالم عرب کے کامل اتحاد کا امکان تاحال دُور دُور تک نظر نہیں آتا۔

اسی نسلی تعصب کے نتیجے میں اللہ تعالےٰ کے اس عذاب کا مزہ بھی اُمّت مسلمہ کو چکھنا پڑا جو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے کہ "اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا وَّیُذِیْقَ بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ" یعنی تمہیں گروہوں میں تقسیم کر دے اور پھر چکھاتے ایک کو دوسرے کی جنگ قوّت کا مزہ! چنانچہ اس صدی کے آغاز میں عربوں کے ہاتھوں ترکوں کا خون بہا اور پھر ۱۹۷۱ء میں بنگالی مسلمان کے ہاتھوں غیر بنگالی مسلمان کے خون کی ہولی اور جان و مالی اور عزّت و آبرو کی دھجیاں بکھرنے کا منظر چشم فلک نے دیکھا۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ!

بہر حال ہمارے نزدیک 'اُمّیّین' کے لئے ۱۹۶۷ء کی ذلّت اور "اٰخَرِیْن" کے ایک اہم حصّے کے لئے ۱۹۷۱ء کی رسوائی کو اُمّتِ مسلمہ کے زوال و انحطاط کی آخری حد کی حیثیت حاصل ہے اور اگرچہ "وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا"[1] کی مستقل وعید اب بھی موجود ہے۔ تاہم کیا عجب کہ اب "عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ" ہی کی شان کا ظہور ہو اور کلنک کا کوئی اور ٹیکہ اُمّت محمّد علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کی پیشانی پر نہ لگے، اگرچہ اس کا تمام تر دار و مدار اُمّت کی اپنی اصلاح پر ہے، بقول جگر مراد آبادی مرحوم ؎

چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل آیت ۸ : "بعید نہیں کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے لیکن اگر تم نے پھر وہی کچھ کیا تو ہم بھی دوبارہ وہی کچھ کریں گے!"

(۲)

جہاں تک تجدیدی مساعی کا تعلق ہے واقعہ یہ ہے کہ تاریخ اسلام کا کوئی دور بھی ان سے بالکل خالی نہیں رہا اور ہر زمانے اور ہر ملک میں ایسے اولوالعزم لوگ پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اپنے حالات کے تقاضوں کے مطابق اصلاحی اور تجدیدی کارنامے سرانجام دیئے۔ لیکن بیسویں صدی عیسوی سے قبل کی ایسی تمام کوششوں کے بارے میں ایک اصولی بات پیش نظر رہنی چاہیئے اور وہ یہ کہ ان کی اصل نوعیت 'احیاءِ دین' کی نہیں بلکہ حفاظت و مدافعتِ دین کی تھی۔ اس لئے کہ ابھی اسلام کا قصرِ عظیم بالکل زمین بوس نہیں ہوا تھا اور خواہ دین کی حقیقی رُوح کتنی ہی مضمحل اور پژمردہ ہو چکی ہو بہرحال اسلام نے جو تہذیبی اور عمرانی نظام دنیا میں قائم کیا تھا اس کا ڈھانچہ برقرار (INTACT) تھا حتیٰ کہ شریعت اسلامی تمام مسلمان ممالک میں بالفعل نافذ تھی چنانچہ تمام تجدیدی مساعی کا اصل ہدف یہ رہا کہ دین کا نظام عقائد و اعمال محفوظ اور اپنی اصل صورت میں قائم رہے اور خارجی و بیرونی اثرات دین کو مسخ نہ کر دیں۔

یہی وجہ ہے کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے دور تک کے تمام مجددینِ اُمت علیہم الرحمۃ کی مساعی اکثر و بیشتر علم و فکر کے میدان ہی تک محدود رہیں اور عقائد و نظریات کی تصحیح و اصلاح ہی کو ان کے اصل ہدف کی حیثیت حاصل رہی اور اس سے آگے اگر قدم بڑھا بھی تو زیادہ سے زیادہ اصلاح اخلاق و اعمال، تزکیۂ نفس اور تربیت روحانی تک، اس سے آگے بڑھ کر گزشتہ صدی سے قبل کسی بھی مجددِ دین کی مساعی نے سیاسی یا عسکری تحریک کی صورت اختیار نہیں کی[1]

---

[1] اس کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمان حکمرانوں کے خلاف "خروج" یعنی مسلح بغاوت پر نہایت سخت بندشیں عاید فرمادی تھیں اور
(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴ پر)

یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کو سابق مجددین کا تجدیدی کام "جزوی" نظر آتا ہے اور انہیں حیرت ہوتی ہے کہ اُمت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ میں کوئی ایک بھی "مجددِ کامل" پیدا نہیں ہوا۔

حالانکہ بات بالکل واضح اور سیدھی ہے کہ ابھی عمارت بالکل منہدم ہوئی ہی نہ تھی کہ بالکل نئی تعمیر کی حاجت ہوتی بلکہ صرف شکستہ و بوسیدہ ہوئی تھی اور ضرورت ہی صرف جزوی اصلاح و استحکام کی تھی۔

یہ تو، جیسا کہ ہم مفصل عرض کر چکے ہیں اس بیسویں صدی کے آغاز میں ہوا کہ ملّت اسلامی کا بوسیدہ قصر گویا دفعتہً زمین پر آ رہا اور اسلام اور مسلمان دونوں اپنے زوال و انحطاط کی آخری حدوں کو پہنچ گئے اور ایک طرف کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود مسلمانوں کی حالت حدیث نبوی کے الفاظ کے مطابق "غُثَاءُ السَّیل" یعنی سیلاب کے جھاگ سے زیادہ نہ رہی اور دوسری طرف اسلام اور قرآن دونوں بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کے مطابق اس حال کو پہنچ گئے کہ وہ لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُہٗ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳ کا) اور جب تک ان کے ہاتھوں شریعت اسلامی کا نفاذ ہو رہا تھا اور کسی "کفر بواح" یعنی کھلے اور صریح کفر کی ترویج و تنفیذ نہیں ہو رہی تھی ان کے ذاتی فسق و فجور اور ظلم و جور کے باوجود ان کے خلاف مسلح بغاوت ممکن نہ تھی!

یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی یہ صورت حال تبدیل ہوئی اور حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر غیر مسلم اقوام کے ہاتھوں میں آئی دفعتہً ان مساعی میں عسکریت بھی پیدا ہو گئی جس کی نہایت شاندار اور تابناک مثال خانوادہ ولی اللّٰہی ہی کے زیر اثر برپا ہونے والی تحریک شہیدینؒ ہے۔

وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ[1] لہٰذا قانون فطرت کے عین مطابق احیاء کا ہمہ جہتی عمل شروع ہوگیا۔

اس احیائی عمل کے بارے میں بھی بعض بنیادی حقائق ذہن نشین رہنے چاہئیں مثلاً ایک[1] یہ کہ یہ کوئی سادہ اور بسیط عمل نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد گوشے ہیں جن میں سے ہر ایک میں اولوالعزم افراد اور جماعتیں برسرکار ہیں اور جو بظاہر ایک دوسرے سے جدا اور مختلف بلکہ بعض پہلوؤں کے اعتبار سے متضاد ہونے کے باوجود اس وسیع تر احیائی عمل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے لئے باعث تقویت ہیں۔ دوسرے[2] یہ کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور ملت اسلامی کی تجدید کا یہ کام دس بیس برس میں مکمل ہونے والا نہیں ہے بلکہ "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ[2]" کے مصداق درجہ بدرجہ بہت سے مراتب و مراحل سے گزر کر ہی پایۂ تکمیل کو پہنچے گا لہٰذا اس ارتقائی عمل کا ہر درجہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے اور چاہے بعد کے مراحل سے گزر کر ہی پہلوں کا کام بہت حقیر بلکہ کسی قدر غلط بھی نظر آئے، اپنے اپنے دور کے اعتبار سے اس کی اہمیت و وقعت سے بالکلیہ انکار ممکن نہیں۔ تیسرے[3] یہ کہ اس ہمہ گیر تجدیدی جدوجہد میں اگرچہ افراد کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے تاہم جماعتوں اور تنظیموں کے مقابلے میں کم تر ہے۔ پھر جماعتیں بھی تحریکوں کی وسعت میں گم ہو جاتی ہیں اور بالآخر تمام تحریکیں بھی اس وسیع احیائی عمل کی پہنائیوں میں گم ہو جاتی ہیں جو ان سب کو محیط ہے۔

---

[1] "ایک زمانہ وہ آئے گا کہ اسلام میں سے سوائے اس کے نام کے کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے بھی سوائے اس کے رسم الخط کے اور کچھ نہ بچے گا۔" مشکوٰۃ شریف، کتاب العلم

[2] سورۃ الانشقاق آیت ۱۹: "تم لازماً چڑھو گے سیڑھی بہ سیڑھی!"

[3] بقول علامہ اقبال ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

ماضی میں ان حقائق کے پیشِ نظر نہ رہنے کے باعث بہت سے لوگوں کے دلوں میں "مہدیٔ موعود" یا "مجدّدِ کامل" بننے کا شوق پیدا ہوتا رہا ہے جس کے نتیجے میں طرح طرح کے فتنے اٹھتے رہے ہیں اور اچھی بھلی تعمیری کوششوں کا رُخ تخریب کی جانب مڑ جاتا رہا ہے!

اِس احیائی عمل کا اوّلین مرحلہ مسلمان اقوام کا مغربی استعمار کے براہِ راست تسلّط سے نجات کا حصول تھا جو بحمداللہ گزشتہ تیس چالیس سال کے دوران تقریباً مکمل ہو چکا ہے اور اگرچہ اب بھی ہم مغرب کی علمی و فکری اور تہذیبی و ثقافتی غلامی میں مبتلا ہیں اور اقوامِ مغرب کی سائنسی و تکنیکی بالادستی کے باعث بہت سے پہلوؤں سے ان کے دست نگر بھی ہیں تاہم خدا کا شکر ہے کہ ایک قضیۂ فلسطین سے قطع نظر اور صرف کشمیر اور اریٹیریا کے علاوہ پورے کرۂ ارضی پر مسلم اکثریت کا کوئی علاقہ براہِ راست غلامی و محکومی کی لعنت میں گرفتار نہیں رہا۔

خالص اصولی و نظریاتی اور تصوّریت پسندانہ (IDEALISTIC) نقطۂ نظر سے تو "مسلمان اقوام" کی اصطلاح ہی قطعاً غلط ہے۔ اس لئے کہ از روئے قرآن و حدیث مسلمانوں کی حیثیت ایک جماعت یا اُمّت یا حزب کی ہے نہ کہ قوم کی۔ اور وہ ایک ناقابلِ تقسیم "وحدتِ ملّی" میں منسلک ہیں جس میں تعدّد و تکثّر کا امکان ہی موجود نہیں کہ اقوام کا لفظ صحیح قرار دیا جا سکے۔ لیکن واقعیت پسندانہ (REALISTIC) نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک جماعت یا اُمّت یا حزب کا کردار (ROLE) تو بہت پہلے ترک کر دیا تھا اور بالفعل ایک قوم ہی کی حیثیت اختیار کر لی تھی البتہ وحدتِ ملّی کا تصوّر اس صدی کے آغاز تک برقرار تھا۔ لیکن، جیسا کہ ہم

پہلے عرض کر چکے ہیں اس صدی کے ربع اوّل کے دوران مغربی استعمار کے ہتھکنڈوں نے اسے بھی ختم کر کے رکھ دیا تھا اور اس وقت فی الواقع روئے ارضی پر کوئی ایک "اُمّت مسلمہ" آباد نہیں ہے بلکہ بہت سی مُسلمان اقوام آباد ہیں -

اسی طرح خالص تصوریت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ع "نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے!" کے مصداق مسلمانوں کی آزادی اور خود مختاری کا احیائے اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے - لیکن واقعیت پسندانہ نگاہ سے دیکھئے تو مستقبل کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا - ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی علمبرداری کی سعادت کسی بالکل ہی نئی قوم کے حوالے فرمادے اور "یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ" کی شان دوبارہ ظاہر ہو - لیکن بحالاتِ موجود تو ع "کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے!" کے مصداق اسلام کا مستقبل موجودہ مسلمان اقوام ہی کے ساتھ وابستہ ہے - اور دونوں باہم لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں ،

اندریں حالات، مسلمان اقوام کا آزادی و خود اختیاری کی نعمت سے ہمکنار ہونا یقیناً احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ مشکل مرحلہ سر ہوگا ہے ان کی سعی بھی اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہی کی جدوجہد کا جزو قرار پائے گی - رہا یہ شبہ کہ ان میں سے اکثر کے قائدین اور زعماء کا دین و مذہب کے ساتھ کوئی واقعی اور عملی تعلق نہ تھا تو اسی کا جواب ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظِ مبارکہ میں کہ "اِنَّ اللّٰہَ یُؤَیِّدُ الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ" (بخاری: کتاب الجہاد) واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے کام بہت نرالے ہیں اور اس کی تدبیریں بہت لطیف اور مخفی اور اس کے منصوبے بہت طویل الذیل اور وسیع الاطراف ہوتے ہیں اور وہ بسا اوقات منافق و فجار سے اپنے دین کی خدمت لے لیتا ہے "وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝

اس ضمن میں ایک اور حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ اگرچہ مختلف مسلمان ممالک میں حصُول آزادی کی تحریکوں کی تقویت کے لیئے جن علاقائی یا نسلی عصبیتوں کو استعمال (INVOKE) کیا گیا انہیں بھی خاص اصولی اور نظری اعتبار سے اسلام کے نظام فکر کے ساتھ سوائے تبایُن و تضاد کے کوئی نسبت حاصل نہیں ہے، لیکن عالم واقعہ میں اس کے سوائے کوئی چارہ کار موجود نہ تھا اس لیئے کہ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا ذہنی و قلبی رشتہ اتنا قوی نہ رہا تھا کہ اسے کسی جاندار اور فعّال تحریک کی اساس بنایا جاسکتا اور حصول استقلال کے لیئے جس مؤثر مزاحمت (EFFECTIVE RESISTANCE) کی ضرورت ہوتی ہے اس کی بُنیاد خیالی یا جذباتی نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی اساسات —— (CONCRETE GROUNDS) ہی پر رکھی جاسکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ترک نیشنلزم کا جذبہ فوری طور پر بیدار نہ ہوگیا ہوتا تو شاید آج ترکی کا نام ونشان بھی صفحہ ارضی پر موجود نہ ہوتا اسی طرح اسلام سے جتنا کچھ حقیقی اور واقعی تعلق اس وقت مسلمانان عرب کو ہے وہ کسے معلوم نہیں - اندریں حالات عرب نیشنلزم ہی یورپی سامراج کے چنگل سے نکلنے کی جدوجہد کے لیئے واحد موجود (THE ONLY AVAILABLE) بنیاد بن سکتا تھا اور ایک وقتی ضرورت اور دفاعی تدبیر کی حد تک اس کے استعمال میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے بشرطیکہ اسے نظام فکر کی مستقل اساس کے طور پر قبول نہ کرلیا جائے اور حصول آزادی کے عبوری مقصد کی تکمیل کے بعد صحیح اسلامی فکر اور وحدت ملی کے شعور و احساس کو اجاگر کیا جائے!

اس پس منظر میں دیکھئے تو تحریک پاکستان کا معاملہ بالکل منفرد نظر آتا ہے۔ برِّعظیم کے مسلمان بھی اگر برطانوی استعمار سے نجات حاصل کرنے کے لیئے ہندی قومیت کی اساس پر غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل کرتے تو اس کے لیئے بھی وجہ جواز موجود تھی؎ لیکن یہ اللہ تعالٰے کا خاص فضل و کرم ہے کہ یہاں کے مخصوص حالات

(حاشیہ صـ۱۹)

کے باعث مسلمانان ہند نے اپنی سیاسی جد وجہد کا آغاز ہی "مسلم قومیت" کی اساس پر کیا جس کے نتیجے میں وہ ملک وجود میں آیا جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح جو اپنا نام "سلمان ابن اسلام" بتایا کرتے تھے، صرف اور صرف "فرزند اسلام" قرار دیا جا سکتا ہے اور جس کے قیام اور بقا کے لئے کوئی وجہ جواز سوائے اسلام کے موجود نہیں ہے۔ گویا پاکستان ع "خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ" کے مصداق اپنی پیدائش (GENESIS) اور ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے تمام مسلمان ممالک سے ایک قدم آگے ہے اور دوسروں کو "قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم!" کا جو کٹھن مرحلہ ابھی طے کرنا ہے وہ کم از کم اصولی اور نظری اعتبار سے یہاں پہلے ہی سے طے شدہ ہے!

مسلمانان ہند کی سیاسی جد وجہد کو اس رُخ پر ڈالنے والے اسباب و عوامل میں سلبی و منفی طور پر سب سے زیادہ دخل ہندوؤں کی روایتی تنگ نظری اور تنگ دلی اور اس سے بھی بڑھ کر مسلمانوں سے اپنی "ہزار سالہ شکست کا انتقام" لینے کے اُس جذبے کو حاصل ہے جو ان کے سینوں میں کھولتے ہوئے لاوے کی طرح پک رہا تھا اس اعتبار سے دیکھا جائے تو گویا ان کا یہ طرز عمل بھی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ممد و معاون بن گیا اور ہم اپنے سابق ابنائے وطن کی خدمت میں بجا طور پر عرض کر سکتے ہیں کہ ؎

تو نے اچھا ہی کیا دوست سہارا نہ دیا
مجھ کو لغزش کی ضرورت تھی سنبھلنے کے لئے!

لے چنانچہ جمعیت علمائے ہند کی سیاسی جد وجہد اسی اصول پر مبنی تھی بلکہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خود نوشت سوانح "نقش حیات" میں تو ثابت کیا ہے کہ خود مجاہد کبیر حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ مسلمانان پنجاب کو "سکھا شاہی" سے نجات دلانے کے بعد اسی اساس پر انگریزوں کے خلاف تحریک چلانے کا ارادہ رکھتے تھے!

مثبت اسباب کے ضمن میں ایک تو یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ مسلمانان ہند کے دلوں میں پہلے بھی جذبۂ ملّی باقی تمام دُنیا کے مسلمانوں سے زیادہ تھا۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تنسیخ خلافت ABOLITION OF CALIPHATE) پر جس قدر شدید ردّ عمل یہاں ظاہر ہوا اس کا عُشر عشیر بھی کہیں اور نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ ایک وقت تھا کہ برّصغیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں سب کی مشترک سیاسی جدّوجہد کا عنوان ہی 'تحریک خلافت' بن گئی تھی ——— اور دوسرے یہ کہ اس خطّے میں علامہ اقبال مرحوم ایسی عظیم شخصیت پیدا ہوئی جس کی انتہائی پُر درد و پُر تاثیر حدی خوانی نے قافلۂ ملّی کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا اور مُسلمانانِ ہند کو جذبۂ ملّی سے سرشار کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ پُوری اُمّتِ مسلمہ پر علامہ مرحوم کا ایک بہت بڑا احسان ہے اور بلاشبہ ان کی ملّی شاعری کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور تجدید و احیائے دین کی وسیع الاطراف جدّوجہد میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

اور اس پس منظر (CONTEXT) میں دیکھا جائے تو عالمی سلامی سربراہی کانفرنس کا پاکستان اور خاص طور پر اس شہر لاہور میں انعقاد بہت معنی خیز ہے۔ جہاں قریباً ثلث صدی قبل قرارداد پاکستان بھی منظور ہوئی تھی اور جہاں دورِ حاضر میں قافلۂ ملّت اسلامیہ کا وہ سب سے بڑا حدی خواں بھی مدفون ہے جو آخری دم تک یہ صدا لگاتا رہا کہ:

بیا تا کارِ ایں اُمّت بسازیم — قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر — دِلے در سینۂ مُلّا گدازیم

اس ہمہ جہتی احیائی عمل کا دوسرا اہم گوشہ وہ ہے جس میں علمائے کرام کی مختلف جماعتیں اور تنظیمیں سرگرم کار اپنے اپنے مخصوص انداز میں اسلام

اور مسلمانوں کی خدمت میں مصروف و مشغول ہیں ۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی برصغیر ہند و پاک کو پورے عالم اسلام میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے چنانچہ علمائے دین کو جس قدر اثر (HOLD) یہاں کے مسلمان عوام پر حاصل ہے وہ دُنیا میں کہیں اور نظر نہیں آتا اور راسخ العقیدہ اسلام (ORTHODOX ISLAM) جتنی مضبوط جڑیں یہاں رکھتا ہے کہیں اور نہیں رکھتا[1] حتّٰی کہ جزیرہ نمائے عرب بھی، جہاں اس صدی کے وسط تک محمدؐ ابن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کی تجدیدی مساعی کے گہرے اثرات قائم رہے ہیں اب اس معاملے میں بہت پیچھے رہ گیا ہے !

اس کی وجہ بھی بادنیٰ تامّل سمجھ میں آجاتی ہے اور وہ یہ کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ایسی جامع شخصیت گزشتہ تین سو سالوں کے دوران میں پورے عالم اسلام میں پیدا نہیں ہوئی اور انہوں نے مُسلمانوں کی توجہ علم دین کے اصل سرچشموں یعنی قرآن اور حدیث کی جانب منعطف کرانے کے ساتھ ساتھ فکر اسلامی کی تدوین نو کا جو عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا اُسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں دین اور رجالِ دین کی ساکھ از سرِ نو مضبوط ہوگئی ۔

اس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ علمائے دین کی مساعی میں اصل زور (EMPHASIS) دورِ حاضر میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور تجدید و احیائے دین کے تقاضوں کو پُورا کرنے کے بجائے دین کے نظام عقائد و اعمال کی حفاظت و مدافعت ہی پر ہے ۔ اس طرح گویا ظاہری اعتبار سے ان کی خدمات کو سابق مجددینِ اسلام کی مساعی کے ساتھ ایک نوع کے تسلسل کی نسبت

---

[1] ۱۹۶۸ء میں جو ایجی ٹیشن ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی کتاب 'ISLAM' کے خلاف ہوا تھا اور اب جو تازہ 'معجزہ' قادیانی مسئلے کے حل کی صورت میں صادر ہوا ہے وہ اس کے منہ بولتے ثبوت ہیں !

حاصل ہے۔ اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے بعض اہم فرق بھی ہیں مثلاً ایک یہ کہ جب سے اجتہاد کا دروازہ بند ہوا اور تقلیدِ جامد کا دور دورہ ہوا اور تشتت و انتشار اور فرقہ پرستی و گروہ بندی نے پاؤں جمالئے۔ ہر فرقے کے علماءِ کرام دین کے نظام عقائد و اعمال کی خاص اسی صورت کی حفاظت و مدافعت پر سارا زور صرف کر رہے ہیں جو ان کے مخصوص فرقے یا گروہ کے نزدیک معتبر و مستند ہے جس سے فرقہ بندی کی جڑیں مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ دوسرے چونکہ انہوں نے علوم جدیدہ اور دورِ حاضر کے افکار و نظریات کا مطالعہ اس طرح براہ راست اور بالاستیعاب نہیں کیا جس طرح اپنے اپنے دور میں امام غزالی اور امام ابن تیمیہ رحمہما اللہ نے کیا تھا لہٰذا وہ دورِ حاضر میں حفاظت مدافعت دین کے اصل تقاضوں کو بھی صحیح طور پر پورا کرنے سے قاصر ہیں۔

لہٰذا دورِ حاضر میں علمائے دین کی حیثیت دین کے جہاز کو آگے بڑھانے والی قوت فراہم کرنے والے انجن کی تو نہیں ہے البتہ کم از کم برصغیر پاک و ہند کی حد تک ایک ایسے بھاری لنگر کی ضرورت ہے جو اس کشتی کو غلط رُخ پر بڑھنے سے روکنے کی خدمت بہرحال سرانجام دے سکتا ہے اور فی زمانہ یہ بھی ایک اہم خدمت ہے!

برصغیر میں اس سلسلے میں ایک اہم مقام اور مرتبہ دیوبندی مکتب فکر کو حاصل ہے جو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے 'فکر' کا نہ سہی 'علم' کا وارث ضرور ہے اور جس کی کوکھ سے دینی مدرسوں اور دارالعلوموں کے ایک عظیم سلسلے کے علاوہ ایک عظیم تحریک بھی برآمد ہوئی ہے جس نے راسخ العقیدہ اسلام کی جڑوں کی آبیاری کے ساتھ ساتھ توجہات کو حقائق ایمانی پر مرتکز (FOCUS) کر دیا اور جس کے زیر اثر کم از کم ایسے لوگ ضرور دین سے قریب ہو رہے ہیں جن کے اذہان فکری و نظری اشکالات سے خالی ہوتے ہیں اور جن کے قلوب میں نیکی کا ایک جذبہ خواہ نیم خوابیدہ حالت ہی

ہیں سہی بہر حال موجود ضرور ہوتا ہے ۔ ہماری مراد، جماعت تبلیغی، سے ہے جس نے اس دور میں دین و مذہب کے نام پر ایک عظیم حرکت عالم اسلام ہی نہیں، دیارِ غیر میں بھی برپا کردی ہے اور جس کے زیر اثر محدود پیمانے ہی پر سہی بہر حال 'تجدید ایمان' کی ایک تحریک بالفعل برپا ہوگئی ہے اور جسے بلاشبہ زیر بحث 'ہمہ جہتی احیائی عمل' میں ایک اہم مقام حاصل ہے ۔

اس 'ہمہ جہتی احیائی عمل' کا تیسرا اور اہم ترین گوشہ وہ ہے جس میں وہ جماعتیں اور تنظیمیں برسرکار ہیں جو قائم ہی خالص احیائی مقاصد کے تحت ہوئیں اور جنہیں اب اس احیائی عمل کے اعتبار سے گویا مقدمۃ الجیش کی حیثیت حاصل ہے ! مختلف مسلمان ممالک میں ایسی جماعتیں اور تنظیمیں مختلف ناموں کے تحت کام کرتی رہی ہیں لیکن ؎ " ہے ایک ہی جذبہ کہیں واضح کہیں مبہم " اور " ہے ایک ہی نغمہ کہیں اونچا کہیں مدھم " کے مصداق ان کی حیثیت ایک ہی تحریک کے تحت کام کرنے والی مختلف تنظیمی ہیئتوں کی ہے ۔

ان جماعتوں میں سے اگرچہ ایک دور میں جوش اور جذبے کی شدت اور اثر ونفوذ کی وسعت کے اعتبار سے مصر کی 'الاخوان المسلمون' توجہات اور اُمیدوں کا مرکز بن گئی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ احیائی عمل کے اس گوشے میں بھی اصل اہمیت برصغیر ہند و پاک ہی کو حاصل ہے ۔

برصغیر میں اس تحریک احیائے دین کے مؤسس اوّلین اور داعیٔ اوّل کی حیثیت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو حاصل ہے جنہوں نے اس صدی کے بالکل اوائل میں 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے " حکومت الٰہیہ " کے قیام اور اس کے لئے ایک " حزب اللہ " کی تاسیس کی پُرزور دعوت پیش کی مولانا کے مخصوص طرز نگارش اور انداز خطابت نے خصوصاً تحریک خلافت کے دوران میں ان کی شہرت کو برصغیر کے طول وعرض میں پھیلایا اور ان کی دعوت نے لاکھوں

مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ لیکن اس کے بعد خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس سبب سے انہوں نے اس عظیم مشن کو خیر باد کہہ کر انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی اور باقی پوری زندگی پوری یکسوئی اور کمال مستقل مزاجی کے ساتھ ہندوستان کی نیشنلسٹ سیاست کی نذر کر دی۔

مولانا کی زندگی کے اس عظیم انقلاب کے ممکن اسباب میں ان کی حد سے بڑھی ہوئی ذہانت کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے کہ ع "اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی!" مولانا بلاشبہ عبقری تھے اور عبقری انسان زیادہ عملی نہیں ہوا کرتے۔ اس کا کچھ سراغ ان کے اس جملے میں بھی ملتا ہے کہ "ہم بیک وقت گلیم زہد اور ردائے رندی اوڑھنے کے جرم کے مرتکب ہیں"۔ اور ایک خیال جو زیادہ قرینِ قیاس ہے یہ بھی ہے کہ مولانا کی حیثیت ایک سکہ بند اور مسلّم عالم دین کی نہ تھی اور اس وقت تک مسلمانانِ ہند پر علماء کی گرفت بہت مضبوط تھی لہٰذا مولانا کو گویا راستہ بند نظر آیا۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کے ذریعے ہم تک پہنچی اور جس کا حاصل یہ ہے کہ دس سال کے عرصے میں[1] اپنے پیش نظر مقصد کے لئے تمہیدی مراحل کی تکمیل کے بعد اپریل ۱۹۲۲ء میں مولانا نے دہلی میں منعقدہ جمعیت علمائے ہند کی کانفرنس میں مفتی کفایت اللہ مرحوم اور مولانا احمد سعید مرحوم کے تعاون سے اگلا قدم اٹھانے کی سکیم بنائی۔ چنانچہ پہلے خود انہوں نے تقریر کی اور اپنے جوشِ خطابت سے حاضرین کے جذبۂ عمل کو ابھارا ہی نہیں للکارا۔ اور پھر مولانا احمد سعید صاحب نے تقریر کی کہ حضرت شیخ الہند رح کی رحلت کے بعد سے مسلمانانِ ہند کی قیادت کی مسند خالی ہے۔ اور اب جو مرحلہ درپیش ہے اُس میں 'شیخ الہند' سے بھی بڑھ کر 'امام الہند' کی ضرورت ہے۔ اب غور کرو اور اس کے لئے کسی موزوں شخص کو تلاش کر کے اس کے ہاتھ پر بیعت کرو اور جدوجہد کا آغاز کر دو۔ لیکن اللہ تعالےٰ کو کچھ اور ہی مطلوب تھا۔

---

[1] 'الہلال' کا اجراء ۱۹۱۲ء میں ہوا تھا!

چنانچہ علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری اٹھے اور انہوں نے براہ راست مولانا آزاد کو خطاب کرکے ان الفاظ سے اپنی تقریر کا آغاز کیا کہ "ایاز قدرِ خود بشناس!" جس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پوری تقریر میں کیا کچھ ہوگا۔ بہرحال اس سے دل شکستہ اور دل برداشتہ ہوکر مولانا اس کام ہی سے دست کش ہوگئے اور اس کے فوراً بعد ہی انہوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کرلی!

اس طرح مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم تو میدان چھوڑ گئے لیکن ان کی زوردار دعوت کی گھن گرج سے مسلم انڈیا کی فضائیں دیر تک گونجتی رہیں اور پھر کم وبیش دس ہی سال بعد ایک باہمت نوجوان[1] نے مولانا کو ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کے ترک کردہ مشن کو اختیار کرنے کے عزم مصمم کے ساتھ ان کی تفسیر 'ترجمان القرآن' ہی کے ہم نام ماہنامے کی ادارت سنبھالی اور اس کے ذریعے اُسی 'حکومت الٰہیہ' کے قیام کا نصب العین اور تجدید واحیائے دین" کی سعی کا ایک نقشہ مسلمانانِ ہند کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔

اس نوجوان میں مولانا مرحوم کی بہ نسبت جوش کم تھا، ہوش زیادہ، ذہانت وفطانت قدرے کم تھی لیکن اسی نسبت سے محنت ومشقت کا مادّہ بہت زیادہ تھا۔ لہٰذا اس نے پہلے چھ سات برس تک پورے صبر واستقلال کے ساتھ خالص انفرادی طور پر کام جاری رکھا۔ کچھ عرصہ 'دارالاسلام' کے نام سے ایک ادارے کے تحت کام کیا اور بالآخر ۱۹۴۱ء میں 'جماعت اسلامی' کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھ دی اور ایک منظم جدوجہد کا آغاز کر دیا۔

جماعت کے قیام سے قبل اس نوجوان نے پہلے انڈین نیشنل کانگریس میں شامل یا اس کے حلیف علماء کے موقف پر شدید پر تنقید کی اور اپنے زورِ استدلال سے ان کے طریق کار کا انجام کار کے اعتبار سے اسلام اور مسلمان دونوں کے حق میں سخت مضر ہونا ثابت کر دیا۔ پھر مسلمانوں کی قومی سیاست پر مدلل تنقید کی اور

---

[1] مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، مؤسس جماعتِ اسلامی۔

اسلام کے بلند ترین تصوریت پسندانہ موقف کے تقابل سے اس کا رخلافِ اسلام ہونا ثابت کیا اور خود اسی بلند ترین تصوریت پسندانہ سطح (HIGHEST IDEALISTIC-LEVEL) پر اپنی جماعت کی اساس رکھ دی۔

چنانچہ جماعت اسلامی کے اساسی مؤقف کا خلاصہ یہ قرار پایا کہ:

۱ - اسلام مذہب نہیں دین ہے اور اس کی اصل حیثیت ایک کامل نظریہ حیات اور مکمل نظام زندگی کی ہے جو اپنی عین فطرت کے تقاضے کے طور پر اپنا کُلّی نفاذ اور کامل غلبہ چاہتا ہے۔

۲ - عبادت صرف مراسمِ عبودیت کا نام نہیں بلکہ اس نظام کی کُلّی اطاعت کا نام ہے۔

۳ - مُسلمان قوم نہیں اُمّتِ مسلمہ اور حزبُ اللہ ہیں اور ان کی اصل حیثیت ایک نظریاتی جماعت (IDEOLOGICAL PARTY) کی ہے جس کا اوّلین مقصد اپنے نظریات کے مطابق انقلاب برپا کرنا اور اپنے نظامِ زندگی کو بالفعل قائم کرنا ہے:

۴ - دُنیا کے موجودہ غیر مسلموں کی ایک عظیم اکثریت قانوناً تو کافر ہے لیکن حقیقتاً کافر نہیں - الّا یہ کہ ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش ہی نہیں کی گئی کہ ان کے انکار یا ردّ کر دینے کا سوال پیدا ہو۔

۵ - اسی طرح دنیا کے موجودہ مسلمانوں کی ایک عظیم اکثریت بھی صرف قانونی اور نسلی، مُسلمانوں پر مشتمل ہے نہ کہ حقیقی مُسلمانوں پر۔ اس لئے کہ نہ ان کے قلوب و اذہان میں اسلام کی نظریاتی و اعتقادی اساسات راسخ ہیں نہ ان کے عمل میں اسلامی قانون کی پابندی اور شریعت کا التزام ہی پایا جاتا ہے۔

۶ - مُسلمانوں کے قومی مفادات کے تحفّظ اور ان کے سیاسی حقوق کی حفاظت یا ان کی آزادی اور خود اختیاری کے حصول کی جدوجہد کا اسلام کی نشاۃ ثانیہ یا احیائے دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۷ - کرنے کا اصل کام، یہ ہے کہ اوّلاً ـــــ بلا لحاظ مذہب و ملّت پوری نوع انسانی کو بندگیٔ رب کی طرف پکارا جائے اور اسلام کی نظریاتی اساسات کو شعوری طور پر قبول کرنے کی دعوت دی جائے اور ـــــ پھر[۲] سابق غیر مسلموں یا نسلی مسلمانوں میں سے جنہیں بھی اللہ تعالیٰ اسلام کو شعوری طور پر قبول کرنے کی توفیق عطا فرما دے - ان کی قوتوں کو ایک ہیئت تنظیمی کے تحت مجتمع کر کے غلبۂ دین حق یا 'حکومت الٰہیہ' کے قیام کی منظم جدوجہد کی جائے -

۸ - اس جدوجہد میں اوّلین اہمیت علمی و فکری انقلاب کو حاصل ہے - پھر عملی و اخلاقی تبدیلی اور معاشرتی اصلاح کو، نظام حکومت کی تبدیلی کا مرحلہ ان سب کے بعد آتا ہے -

ہمارے نزدیک اس مؤقف میں انتہا پسندی کی شدّت تو موجود ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کا ٹھیٹھ نظریاتی اور اصولی مؤقف یہی ہے اور دوسری احیائی مساعی کے ساتھ ساتھ اس خالص اصولی اساس پر کسی تحریک کا اٹھنا وقت کی اہم ضرورت تھی جو مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے ہاتھوں پوری ہوئی اور ہم داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے اس پر کہ مولانا موصوف اور ان کے رفقائے کار حالات کی سخت نامساعدت کے علی الرغم اور ہر طرح کے طعن و طنز اور تمسخر و استہزاء کے باوجود مسلسل چھ سال اس مؤقف پر ڈٹے رہے - نتیجۃً عزیمت کی نہایت اعلیٰ مثالیں چشم فلک نے دیکھیں اور "تاریخ دعوت و عزیمت" میں ایک نہایت درخشاں باب کا اضافہ ہو گیا - اس طرح گویا وہ کام جسے احیائے اسلام کے 'راست اقدام' سے تعبیر کیا

---

[۲] واضح رہے کہ جب جماعت اسلامی کے قیام پر مولانا امین احسن اصلاحی کا قرآنی فکر بھی اس تحریک کے ساتھ آ شامل ہوا تو 'حکومت الٰہیہ' کی اصطلاح سرے سے متروک ہو گئی اور اس کی جگہ 'شہادتِ حق' اور 'اقامتِ دین' کی خالص قرآنی اصطلاحوں نے لے لی!

جا سکتا ہے اور جس کا ابتدائی خاکہ (BLUE-PRINT) مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے تیار کیا تھا عملاً مولانا مودودی کے ہاتھوں شروع ہوا۔

لیکن افسوس کہ ع "خوش درخشید و بے شعلۂ مستعجل بود!" کے مصداق مولانا مودودی اور جماعت اسلامی اس بلند و بالا موقف پر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے اور ۱۹۴۷ء میں جیسے ہی مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور پاکستان کے نام سے ایک آزاد مسلمان ریاست قائم ہوئی اور متعدد اسباب سے ایک توقع سی نظر آئی کہ یہاں اسلام کے نام پر ایک سیاسی تحریک چلائی جا سکتی ہے۔ انہوں نے اپنے اصولی موقف کو ترک کر کے بغیر اس کے کہ کوئی علمی و فکری انقلاب آیا ہو یا اخلاقی و عملی تبدیلی معاشرے میں برپا ہوئی ہو، نظامِ حکومت کی 'اصلاح' کے لئے عملی سیاسیات کے میدان میں قدم رکھ دیا لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا وہ توقع تو موہوم سے موہوم تر ہوتی چلی گئی البتہ سیاست کی سنگلاخ وادی میں یہ تحریک "وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ"[1] کے مصداق پست تر موقف اختیار کرنے پر مجبور ہوتی چلی گئی۔

پہلے خیال تھا کہ خالص اسلام کے نام اور محض اپنے زورِ بازو کے بل پر یہ مرحلہ سر ہو جائے گا لہٰذا کمال شانِ استغنا کے ساتھ دوسری سیاسی جماعتوں کی اشتراکِ عمل کی پیش کشوں کو ٹھکرا دیا گیا۔ جب پنجاب کے ۱۹۵۱ء کے الیکشن کے بعد یہ مغالطہ دُور ہوا تو خیال ہوا کہ مذہب کے نام پر دوسری مذہبی جماعتوں کے تعاون سے یہ مہم سر کی جائے۔ پھر جب معلوم ہوا کہ یہ بھی ممکن نہیں اور چڑھائی اتنی سخت ہے کہ گاڑی اس سکنڈ گیئر میں بھی آگے نہیں بڑھ سکتی تو گویا ٹاپ گیئر آزمایا گیا اور ایک درجہ اور نیچے اتر کر محض جمہوریت کے نام پر مذہبی و لادینی تمام عناصر کے ساتھ مل کر آگے بڑھنے کی کوشش کی گئی۔

---

[1] "سورۂ اعراف آیت ۱۷۶: لیکن وہ تو زمین ہی میں دھنس کر رہ گیا!"

سابق صدر ایوب مرحوم کا پورا گیارہ سالہ دور حکومت اسی "بحالی جمہوریت" کے مہم کی نذر ہوگیا - لیکن جب اُن کے اقتدار کی عمارت گری تو اس کے ملبے سے کچھ 'اور' ہی برآمد ہوگیا ! -

ہمارے پیش نظر اس وقت نہ تو تاریخ نگاری ہی ہے نہ جماعت اسلامی کے مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی یا قیاس آرائی، نہ ہم اس وقت اس بحث ہی میں اُلجھنا چاہتے ہیں کہ مولانا مودودی کے اس 'انقلابِ حال' کے اسباب کیا تھے (اس پر ہم اپنی تالیف "تحریک جماعت اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ" میں مفصّل بحث بھی کر چکے ہیں)، ہمیں اس معاملے کے جس پہلو سے اصل دلچسپی ہے وہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے اس 'انتقالِ موقف' سے احیائے اسلام کے ہمہ جہتی عمل میں ٹھیٹھ اصولی اسلامی تحریک کی جگہ پھر خالی ہوگئی اور اس مہیب خلا کو پُر کرنے کی کوئی صورت تا حال پیدا نہیں ہوئی جو اپنے پیش رو مولانا آزاد اور ان کی جماعت حزب اللہ کی طرح مولانا مودودی اور ان کی قائم کردہ جماعت اسلامی نے جیتے جی مرحوم ہو کر پیدا کیا ہے چنانچہ اب اگرچہ سیاسی و قومی سطح پر بھی احیائی عمل جاری ہے اور علماء کرام کی سرگرمیاں بھی اپنے اپنے رنگ میں تیز سے تیز تر ہوگئی ہیں، احیائی عمل کا یہ تیسرا اور اہم ترین گوشہ ویران و سنسان پڑا ہے !

جماعت اسلامی کے موقف میں یہ تبدیلی اصولاً ۱۹۴۷ء ہی میں پیدا ہوگئی تھی لیکن کم و بیش دس سال یہ اپنی پہلی قوت کے زور میں بڑھتی چلی گئی اور اس تبدیلی کا احساس بھی لوگوں کو نہیں ہوا، لیکن ۵۷-۱۹۵۶ء میں جماعت میں اس احساس نے زور پکڑا اور طریق کار کے بارے میں ایک اختلاف رائے ظاہر ہوا جس نے ایک ہنگامے کی صورت اختیار کر لی - نتیجۃً جماعت کے 'اکابر' کی اکثریت چند 'اصاغر' سمیت جماعت سے کٹ گئی - اُن 'اصاغر' میں سے

ایک ان سطور کا راقم بھی ہے۔ بعد ازاں 'بڑے'، تو اپنے اپنے 'بڑے' کاموں میں مشغول و مصروف ہو گئے لیکن یہ 'چھوٹا' ؎

"ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک! اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک!"

کے مصداق اپنے دل و دماغ کو اس جنت گم گشتہ کے خیال سے فارغ نہ کر سکا بلکہ جیسے جیسے دن بیتے اس کا حال یہ ہوتا چلا گیا کہ ؎

تخم جس کا تُو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکت غم سے یہ اُلفت اور محکم ہو گئی!

وہ جب جماعت سے علیحدہ ہوا اس کی عمر کُل پچیس برس تھی۔ بالکل نوعمری کا عالم، نہ علم نہ تجربہ، لہٰذا پورے دس برس اس نے اس انتظار میں بسر کیے کہ 'بڑوں' میں سے کوئی ہمت کرے اور از سرِ نو سفر کا آغاز کر دے لیکن اللہ کو یہ بھی منظور نہ ہوا تا آنکہ ۶۷-۱۹۶۶ء میں اُس نے خود کمر ہمت کسی اور بفحوائے الفاظ قرآنی "اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ" درس قرآن کی صورت میں ٹھیٹھ اسلامی دعوت کیلئے ذہنی و فکری سطح پر میدان ہموار کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اس کے کام کو اللہ تعالیٰ نے شرف قبول عطا فرمایا اور چند ہی سالوں میں اس کے قائم کردہ 'حلقہ ہائے مطالعہ قرآن' کی کوکھ سے 'مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' برآمد ہو گئی اور اب اس کے بھی دو ہی سال بعد وہ اسی ٹھیٹھ اصولی اسلامی تحریک کے اِحیاء کے لئے "تنظیم اسلامی" کے قیام کا ارادہ کر رہا ہے!

اسے خوب معلوم ہے کہ اس کے پاس نہ مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی سی عبقریت اور ذہانت و فطانت ہے، نہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی سی صلاحیتِ کار اور محنت و مشقت کا مادہ۔ پھر نہ وہ شعلہ بیان خطیب ہے نہ صاحب طرز ادیب، بایں ہمہ ایک احساس فرض ہے جو چین

نہیں لینے دیتا اور ایک عظیم تحریک کی امانت کے بار کا احساس گراں ہے جس نے اسے ؎

"ہرچہ بادا باد، ماکشتی در آب انداختیم!"

کے مصداق اس پرخطر وادی میں کود پڑنے پر مجبور کر دیا ہے!

اب جو لوگ شخصیتوں اور جماعتوں کی سطح سے بلند تر ہو کر سوچنے اور غور و فکر کرنے ہمّت اور صلاحیت ہی سے عاری ہوں اُن کا معاملہ تو دوسرا ہے البتہ وہ لوگ جو کسی تحریک کے بنیادی نظریات و مقاصد پر نظر رکھتے ہوئے اپنے مؤقف پر نظرِ ثانی کی ہمت کر سکیں۔ ان کے لئے ایک لمحہ فکریہ ہے۔ انہیں چاہیئے کہ ٹھنڈے دل کیساتھ ہمارے مؤقف پر غور کریں۔ اور اگر انہیں اس میں صحت و صداقت نظر آئے تو ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہوں اور کمر ہمّت کسیں! بہر حال اپنی حد تک ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ

دریں دریائے بے پایاں، دریں طوفان موج افزا　　سر افگندیم، بسم اللہ مجرھا و مرسٰھا!

۱؎ یقیناً یہی قرآن ہے جو رہنمائی فرماتا ہے اس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی اور سب سے درست ہے!" عجب حُسنِ اتفاق ہے کہ یہ الفاظ مبارکہ سورۂ بنی اسرائیل میں ان آیات کے فوراً بعد وارد ہوئے ہیں جو بنی اسرائیل اور اُمّتِ مسلمہ کی تاریخ میں مماثلت و مشابہت کے بیان میں اس تحریر میں تفصیل کے ساتھ زیر بحث آچکی ہیں۔ مزید غور طلب نکتہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ کا ذکر شروع ہوا توراۃ کے ذکر سے "وَاٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًی لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ" اور اس کا اختتام ہوا قرآن کے ذکر پر۔ گویا سابق اُمّت کی تاسیس بھی کتاب ہی کی بنیاد پر ہوئی تھی اور اس کے معزول کئے جانے کے بعد نئی اُمّت مسلمہ کی تاسیس بھی 'الکتٰب' ہی کی بنیاد پر ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی 'تجدید' کے لئے بھی مبنیٰ و اساس قرآن کے سوا اور کوئی چیز نہیں بن سکتی ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن　　نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن (اقبال)

فہرست مطبوعات

مرکزی انجمن خُدّامُ القُرآن لاہور

تصانیف امام حمیدُالدین فراہیؒ

مجموعہ تفاسیر فراہی	ہدیہ -/۲۴/- روپے
اقسام القرآن	ہدیہ ۳/۷۵ "
ذبیح کون ہے ؟	ہدیہ ۴/۵۰ "

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

سلسلۂ تدبر قرآن

مبادیٔ تدبر قرآن	ہدیہ -/۸/- روپے
مقدمہ تدبر قرآن و تفاسیر آیت اللہ بسم اللہ و سورۂ فاتحہ	ہدیہ -/۳/- "
تدبر قرآن جلد اوّل : از ابتداء تا سورۂ آل عمران	" -/۵۰/- "
تدبر قرآن جلد دوم : سورۂ نساء تا سورۂ اعراف	" -/۵۰/- "
تدبر قرآن جلد سوم : سورۂ انفال تا سورۂ بنی اسرائیل	" -/۵۰/- "
تدبر قرآن جلد چہارم : سورہ کہف یا سورۂ قصص	" -/۵۰/- "
حقیقتِ دین : مشتمل بر حقیقت شرک، حقیقت توحید، حقیقت تقویٰ، حقیقت نماز (زیر طبع)	
دعوت دین اور اس کا طریق کار	" -/۱۰/- "
اقامت دین کے لیے انبیاء کرام کا طریق کار	" ۱/۲۵ "
قرآن اور پردہ	" ۱/- "
اسلامی قانون کی تدوین	" ۵/- "
اسلامی ریاست	" ۲۰/- "
پاکستانی عورت دوراہے	" ۱۰/- "

مطالعۂ قرآن حکیم

پر مشتمل ڈاکٹر اسرار احمد کی ۲ نشری تقاریر

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ
تَسْمَعُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝ اِنَّ
شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ
فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

یہ سورۂ انفال کی آیات ۲۰ تا ۲۳ ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے :-

"اے ایمان والو! اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو اور اُس سے رُوگردانی نہ کرو درانحالیکہ تم سُن رہے ہو، اور اُن لوگوں کے مانند نہ بنو جو کہتے تو ہیں کہ ہم نے سُن لیا، جب کہ فی الحقیقت وہ نہیں سُنتے، یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین جانور ہیں، یہ بہرے گونگے لوگ جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ اور اگر اللہ جانتا کہ اُن میں کوئی صلاحیت ہے تو انہیں سُننے کی توفیق بھی عطا فرما دیتا۔ (بحالتِ موجودہ تو) وہ اگر انہیں سُنوا دیتا تب بھی وہ بے رُخی کا اظہار کرتے ہوئے مُنہ پھیر جاتے!"

اِن آیاتِ مبارکہ میں اگرچہ بظاہر خطاب عام ہے گویا تمام اہلِ ایمان مخاطب ہیں لیکن ان میں اصل رُوئے سخن اُن چند مسلمانوں کی جانب ہے جنھوں نے جنگِ بدر سے قبل مشاورت میں اس پر اصرار کیا تھا کہ کفارِ مکّہ کے لشکر کا رُخ کرنے کی بجائے تجارتی قافلے پر حملہ کیا جائے۔ قرآنِ حکیم کا یہ عام اسلوب ہے کہ مسلمانوں میں سے کسی ایک فرد یا چند افراد کی جانب سے کسی کمزوری کا مظاہرہ ہوتا تھا تو اُن کو مُعیّن یا مشخص کر کے گرفت نہیں کی جاتی تھی بلکہ تنقید اور گرفت کا انداز عمومی ہوتا تھا۔ اِس سے یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیئے کہ مسلمانوں کی اکثریت یا

اُن کی جمعیّت کا معتدبہ حصّہ اِس کمزوری میں مبتلا تھا ـــــ پھر یہ کہ اگر مشورے کی صورت میں ابتداءً بعض حضرات کی جانب سے یہ رائے ظاہر ہوئی تو اُس میں بھی ہرگز کوئی قباحت نہ تھی۔ اِس لئے کہ مشاورت کا تو فائدہ ہی یہ ہے کہ دونوں پہلو پوری طرح کھل کر سامنے آ جائیں اور دونوں صورتوں کے حق میں یا اُن کے خلاف جو بھی دلائل موجود ہوں اُن پر پوری طرح غور و خوض ہو جائے ـــــ مسلمان جس بے سروسامانی کی حالت میں مدینے سے نکلے تھے، اس کے پیشِ نظر اگر کسی نے یہ رائے دی کہ پہلے قافلہ پر حملہ کر کے جو سامان اور اسلحہ ہاتھ آ سکتا ہو، حاصل کر لیا جائے اور پھر مکّے سے آنے والے لشکر سے دو دو ہاتھ کئے جائیں تو یہ بات بھی بالکل بے وزن نہ تھی ـــــ البتّہ جب نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا رُجحانِ غالب سامنے آ گیا کہ آپ لشکر ہی کا رُخ کرنا چاہتے ہیں، تب بھی اگر کسی نے اپنی رائے پر اصرار کیا، گویا وہ صورت ہوئی جو آیت ۶ میں بیان ہوئی یعنی: "یُجَادِلُوْنَكَ فِی الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ (یعنی وہ آپ سے امرِ حق کے بارے میں جھگڑ رہے تھے۔ اِس کے بعد بھی کہ وہ واضح ہو چکا تھا، بالکل ایسے جیسے آنکھیں کھول دیکھتے موت کی طرف دھکیلا جا رہا ہو!) ـــــ تو یہ یقیناً ایک بڑی کمزوری اور ہر اعتبار سے قابلِ گرفت بات تھی، خواہ اُس کا ظہور کسی ایک ہی شخص کی جانب سے ہوا ہو۔ قرآن حکیم نے اپنے عام اسلوب اور تعلیم و تربیت کے حکیمانہ طریق کے مطابق اس سے ایک عمومی تلقین و تذکیر کی تقریب پیدا کر لی۔ چنانچہ پہلے تو مثبت ہدایت دی گئی کہ": اے اہلِ ایمان! اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت پر جمے رہو۔ اِس لئے کہ یہ ایمان و اسلام کا عین تقاضا اور اُن کا لُبِّ لُباب ہے۔ اطاعت اگر صرف مارے باندھے کی ہو تو اس معاملہ لامحالہ واضح احکامات تک ہی محدود رہتا ہے، لیکن جب یہ اطاعت بطوعِ خاطر اور بطیبِ نفس ہو تو اس صورت میں تو چشم و ابرو کے اشارے بھی حکم کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور جس کی اطاعت مطلوب ہو اُس کے رُجحان کا مترشّح ہونا ہی کافی ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی وہ کیفیت ہے جس کے ساتھ اہلِ ایمان کو اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ اور آیا یہ کیفیت موجود ہے یا نہیں اِس کا فیصلہ ہر شخص اپنے باطن میں جھانک کر خود کر سکتا ہے ـــــ اِس مُثبت تاکید کے بعد سلبی انداز میں فرمایا کہ": اِس سے رُوگردانی نہ کرو، درآنحالیکہ تم سُن رہے ہو!" اِس میں ایک قابلِ توجّہ بات تو یہ ہے کہ ابتداء میں اطاعت کے ضمن میں اللہ

اور رسول دونوں کا ذکر ہوا لیکن یہاں ضمیر واحد کی استعمال ہوئی جس سے اس حقیقت کی جانب رہنمائی ہوگئی کہ دین میں اطاعت اصولاً اور حقیقتاً تو اللہ اور اس کے رسول دونوں کی ہے۔ لیکن عملاً یہ اطاعت کُل کی کُل رسول ہی کی ہے، اس لئے کہ اللہ کے احکام بھی اہلِ ایمان تک رسول ہی کی زبانِ حقیقت ترجمان کے ذریعے پہنچتے ہیں — یہی حقیقت ہے جسے علامہ اقبال مرحوم نے ان الفاظ میں ادا کیا کہ: ؎

"بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست!!"

آیت کے آخر میں: "وَ اَنۡتُمۡ تَسۡمَعُوۡنَ" کے الفاظ فصاحت و بلاغت کا ایک نادر نمونہ ہیں۔ ان سے ایک جانب تو اشارہ ہوگیا اس حقیقت کی طرف کہ اگر اس طرزِ عمل کا مظاہرہ رسول کے ساتھیوں کی جانب سے اس کی حیاتِ طیّبہ ہی کے دوران ہو جب کہ وہ براہِ راست خود رسول سے احکام سُن رہے ہوں تو آئندہ کیا توقّع رکھی جاسکتی ہے یہ صورتِ حال تو گویا وہی ہوگی جس کا شکوہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے بنی اسرائیل سے کیا تھا کہ: "تم تو اُس دُلہن کے مانند ہو جو پہلی ہی شب میں بیوفائی کی مرتکب ہوئی ہو!" —— ان الفاظِ مبارکہ میں جہاں تمام اہلِ ایمان کی غیرتِ ایمانی کو ایک کھلا چیلنج ہے، وہاں ان معدودے چند لوگوں کے لئے زجر و توبیخ کا لطیف انداز بھی موجود ہے جو کفّار کے لشکر سے کنّی کترانا چاہتے تھے —— اور دوسری جانب یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ دین میں جو اطاعت مطلوب ہے اُس میں سمع و طاعت کی شان موجود ہونی چاہئے یعنی مجرّد سُننے پر اطاعت کو لازم جانا جائے خواہ کسی حکم کی علّت و حکمت سمجھ میں آئے، خواہ نہ آئے ؛

پہلی آیت میں جو زجر و توبیخ اور ڈانٹ ڈپٹ نرمی اور ملائمت کے ساتھ لطیف پیرایۂ بیان میں وارد ہوئی تھی، بعد کی آیات میں اس میں وضاحت اور شدّت دونوں کا اضافہ ہوگیا اور یہاں بطورِ نشانِ عبرت حوالہ دیا گیا یہود کا جن کے نقضِ عہد کی مفصّل رُوداد سورۂ انفال کے نزول سے قبل سورۂ بقرہ میں بیان ہو چکی تھی، کہ وہ بظاہر تو: "سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا!" کہتے رہے لیکن اُن کا طرزِ عمل ہمیشہ: "سَمِعۡنَا وَ عَصَيۡنَا!" کی عکّاسی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اُن کے بعض شریر لوگ تو فی الواقع کہتے بھی: "عَصَيۡنَا!" ہی تھے۔ بس فرا زبان کو تھوڑا سا اِس طرح موڑ کر کہ اگر کوئی گرفت کرے تو کہہ سکیں کہ ہم نے تو: "اَطَعۡنَا!" کہا تھا۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو گونگے اور بہرے اور عقل سے کورے ہی نہیں،

بدترین حیوان قرار دیا۔ اس لئے کہ اگر انسان سماعت و بصارت اور تعقل و تفکر کی جملہ صلاحیتوں سے بہرہ ور ہونے کے باوصف یہ روش اختیار کرتا ہے تو وہ واقعتہً حیوانوں سے بدتر ہے ـــــ بفحوائے الفاظِ قرآنی: "لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ" (اُن کے دل ہیں لیکن تفقہ سے خالی، آنکھیں ہیں لیکن بصارت سے عاری، اور کان ہیں لیکن سماعت سے تہی۔ یہ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ اُن سے بھی گئے گذرے!!)

آخری آیت میں اس معاملے میں ایک ممکنہ اشکال کو حل فرمایا گیا ہے اور ایک ایسے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے، جو بعض ناپختہ ذہنوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ ایسے لوگوں کی فطری استعدادات کیسے زائل ہو جاتی ہیں، اور اُن کی صلاحیتیں کیوں سلب ہو جاتی ہیں۔ اِس ضمن میں بھی اس مقام پر اجمالی سے کام لیا گیا ہے، اِس لئے کہ اِس معاملے پر بھی تفصیلی بحث سورۂ بقرہ میں متعدد مقامات پر وارد ہو چکی تھی۔ یعنی یہ کہ جب انسان سب کچھ جاننے، بُوجھنے اور حق کو پوری طرح پہچاننے کے باوجود ہوا و ہوس کی پیروی میں اعراض و انکار کی رَوِش پر مسلسل عمل پیرا رہتا ہے تو اُس کی فطری صلاحیتوں پر زنگ لگنا شروع ہو جاتا ہے اور طبعی استعدادات سلب ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ بصارت، بصیرت سے تہی ہو جاتی ہے اور اب وہ صرف حیوانوں کا سا سُننا سُنتا اور چوپایوں کا سا دیکھنا دیکھتا ہے۔ اور پھر دل میں بھی سختی پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے تا آنکہ وہ نوبت آ پہنچتی ہے کہ: "ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً" (پھر تمھارے دل سخت ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ وہ پتھروں کے مانند ہو گئے بلکہ سختی میں اُن سے بھی بڑھ گئے!) ـــــ تب اُن کی ضلالت و گمراہی پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھی آخری مُہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے یعنی: "خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ" (اللہ نے مہر کر دی ہے اُن کے دلوں اور کانوں پر، اور اُن کی آنکھوں پر پردہ پڑ چکا ہے!) ـــــ!!!

آیت زیرِ درس میں اشارہ فرمایا کہ خیر کا اصل محل و مقام، اور بھلائی کا اصل منبع و سرچشمہ تو دل ہے۔ اور اللہ جانتا ہے کہ اُن کے دل خیر سے خالی ہو چکے ہیں تو اب ان کو

سنوانا بھی چہ سود ؟ اگر اللہ دیکھتا کہ اُن کے دلوں میں کچھ خیر باقی ہے تو انہیں سنوا بھی دیتا لیکن بحالتِ موجودہ تو سنوانا لاحاصل ہے۔ وہ سب کچھ سن کر بھی رُوگردانی کی رَوِش پر قائم رہیں گے ۔

اِس سے اِس مغالطے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے کہ اِن آیات کے نزول کے وقت مسلمانوں میں کچھ لوگ اِس کیفیت کے حامل بالفعل موجود بھی تھے۔ دراصل یہ قرآنِ حکیم کا مبنی بر حکمت اُسلوب ہے کہ کسی معمولی بات کے تمام ممکنہ مضمرات کو کھول کر بیان کر دیا جائے ـــــ اور کسی تِل کی اوٹ میں جتنے پہاڑ چھپے ہو سکتے ہوں اُن سب کو نمایاں کر دیا جائے تاکہ اگر کسی کے دل میں کسی بیماری کا آغاز ہو رہا ہو تو وہ فوراً متنبہ ہو جائے۔ اس لیے کہ مداوا بالعموم مرض کی ابتدائی صورتوں ہی میں ہو سکتا ہے، ورنہ اگر بی۔ بی تیسرے درجے کو پہنچ چکی ہو تو علاج لاحاصل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم چونکا دینے والا انداز اختیار کرتا ہے کہ جن کی اصلاح ہو سکتی ہو وہ فوراً اپنے باطن کا جائزہ لے کر متوجہ ہو جائیں اور مرض کے ازالے کی سعی کر سکیں ـــــ ورنہ معاذ اللہ اصحابِ بدر میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ اُس کی باطنی کیفیت وہ ہو سکتی ہے جو اِن آیات میں بیان ہوئی۔ البتہ یہ بالکل مطابقِ واقعہ تصویر ہے علمائے یہود کی جن کی ریشہ دوانیوں کا آغاز یوں تو مکّی دَور کے اواخر ہی سے ہو گیا تھا، لیکن ہجرت کے بعد تو وہ پورے عُروج کو پہنچ گئی تھیں ۔ وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(۲)

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۲۴ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۲۵

یہ سورۃ الانفال کی آیات ۲۴ تا ۲۵ ہیں، اور اِن کا ترجمہ یہ ہے :

"اے ایمان والو اللہ و رسول کی پکار پر لبّیک کہو جب کہ رسول تمھیں اُس چیز کی طرف بُلا رہا ہے جو تمھیں زندگی عطا فرمانے والی ہے۔ اور جان لو کہ اللہ انسان اور

اُس کے دل کے درمیان حائل ہو جایا کرتا ہے اور یاد رہے کہ تم سب اُسی کی جانب اکٹھے کیے جاؤ گے۔ اور اُس فتنے سے بچو جو تم میں سے بالخصوص انہی کو لاگو نہ ہوگا جنھوں نے ظلم کا ارتکاب کیا ہوگا اور خوب جان رکھو کہ اللہ نہایت سخت سزا دینے والا ہے!

اِن آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اسی قانونِ ہدایت و ضلالت کو ایک اور اسلوب سے واضح فرمایا ہے جو ان سے پہلے کی تین آیات میں سابقہ اُمتوں بالخصوص یہود کے حوالے سے تفصیلاً بیان ہو چکا ہے۔

یہاں واضح فرمایا جا رہا ہے کہ عافیت اور خیریت اِسی میں ہے کہ بندۂ مومن سمع و طاعت پر پوری دلی آمادگی کے ساتھ کاربند رہے اور جب بھی پکارا جائے، فوراً حاضر ہو جائے اور جو حکم ملے تا حدِ استطاعت اُسے بجا لانے کی کوشش کرے۔ یہاں بھی بالکل اسی طرح آغاز میں اللہ اور رسول دونوں کا ذکر ہے، لیکن بعد میں "دَعَاکُمْ" کی ضمیرِ فاعلی صرف رسول کی جانب راجع ہے جیسے کہ اس سے قبل آیت ۲۰ میں گذر چکا ہے۔ گویا اطاعت اور استجابت دونوں فی الحقیقت اللہ اور اُس کے رسول دونوں کے لئے ہیں۔ لیکن بالفعل مطاع اور داعی اللہ کا رسول ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) یہاں ایک مزید لطیف اشارہ ہو گیا اِس بات کی جانب کہ رسول کی پکار بعض اوقات ایسے اُمور کے لئے بھی ہو سکتی ہے جو بظاہر تمھیں گھاٹے کا سودا نظر آئیں، اِس لئے کہ ان میں جان و مال کے زیاں کا خطرہ ہو۔ لیکن اگر تم رسول کی رسالت پر دل سے ایمان لائے ہو تو تمھیں یقین رکھنا چاہیئے کہ اِسی گھاٹے میں اصل نفع مضمر ہے۔ اور انہی خدشات و خطرات کے پردوں میں حیاتِ جاودانی کا راز چھپا ہوا۔ جیسے کہ بہت خوب کہا کسی کہنے والے نے کہ

سیاہیوں سے حزیں ہونا غموں سے اندوہگیں ہونا ❖ انہی کے پردے میں زندگی کی نئی سحر جگمگا رہی ہے

——— اور یہی بات تھی جو سورۂ بقرہ میں بطورِ پیشگی واضح کر دی گئی تھی کہ: "وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝" (اور ہرگز مردہ نہ کہو انہیں جو اللہ کی راہ میں قتل ہو گئے، وہ تو زندہ ہیں اگرچہ تمھیں اس کا ادراک نہیں ہے!) ——— اِس حد درجہ دلنشیں پیرائے میں ترغیب و تشویق کے بعد وارد ہوئی وعیدِ شدید جو پے بہ پے چار تشبیہات پر مشتمل ہے:

۱- اوّل یہ کہ جان رکھو کہ اللہ انسان اور اُس کے دل کے مابین حائل ہو جایا کرتا ہے: اعاذنا اللہ من ذالک ـــــ یہ اُسی قانونِ ہدایت وضلالت کی جانب نہایت فصیح و بلیغ اشارہ ہے جس کی تفصیل آیاتِ سابقہ میں بیان ہو چکی ہے۔ یعنی یہ کہ حق کے منکشف ہو جانے کے بعد بھی اگر انسان تعصّب یا مصلحت کے باعث انکار و اعراض کی رَوِش پر قائم رہے تو قبولِ حق کی استعداد سلب ہونی شروع ہو جاتی ہے اور اس کا آخری مقام وہ ہے جسے قرآن ختمِ قلوب یا طبعِ قلوب سے تعبیر کرتا ہے اور اسے اللہ اپنی جانب اِس لئے منسوب کرتا ہے کہ یہ اُسی کے قانونِ ہدایت و ضلالت کے تحت واقع ہوتا ہے۔ یہ بات سورۂ انعام کی آیت ۱۱۰ میں نہایت وضاحت سے بیان ہوئی ہے یعنی:
"وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ؀ (اور ہم اُلٹ دیں گے اُن کے دلوں اور اُن کی آنکھوں کو جیسے کہ وہ ایمان نہیں لائے تھے اس پر پہلی بار، اور ہم چھوڑ دیں گے اُن کو سرکشی میں بھٹکتے ہوئے!) ـــــ آیتِ زیرِ درس میں ایک عجیب نقشہ کھینچا گیا ہے ـــــ کہ انسانی وجود میں قلب تجلّیاتِ ربّانی اور انوارِ ایمانی کا محل و مورد ہے۔ لیکن انسان حق سے مسلسل اعراض و انکار کے باعث اپنے اور اس مطلعِ انوارِ رحمانی کے مابین اللہ کے قانونِ ہدایت و ضلالت کو حائل کرا لیتا ہے ـــــ گویا تعبیرِ قرآنی کی رُو سے خود اللہ انسان اور اس کے قلب کے مابین حائل ہو جاتا ہے۔ اللہ ہمیں اس انجامِ بد سے بچائے ؞

۲- دوسری تنبیہ یہ وارد ہوئی کہ یہ اعراض عن الحق کی نقد سزا ہے جو اِس دُنیا میں تمہیں مل جاتی ہے۔ اِس کی اصل پاداش آخرت میں ملے گی اور اس سے کوئی جائے فرار نہیں ہے۔ اِس لئے کہ تم چاہو یا نہ چاہو بالآخر اُسی کی طرف سمیٹے جاؤ گے۔ اور اس اعراض عن الحق کی پاداش میں جہنّم کا ایندھن بن کر رہو گے!!

۳- تیسری تنبیہ بالخصوص اُن لوگوں کو ہے جو اجتماعی ذمّہ داریوں سے کنّی کترا کر اپنے آپ کو دوسروں کے بُرے بھلے سے بالکل بری قرار دے لیتے ہیں اور صرف انفرادی تقویٰ و پرہیزگاری کو اُخروی نجات کا کامل ذریعہ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ فرمایا کہ جس طرح خود دُنیا میں تم دیکھتے ہو کہ اگر کسی بستی میں حفظانِ صحت کے اُصُولوں پر عام عمل نہ ہو رہا ہو اور اُس کے نتیجے میں کوئی وبا پھوٹ پڑے تو اس کی لپیٹ میں صرف وہی نہیں آتے جنھوں نے

گندگی پھیلائی ہو بلکہ وہ بھی آجاتے ہیں جنھوں نے خواہ اپنے گھروں میں حفظانِ صحت کے اصولوں کا کتنا بھی لحاظ کیا ہو، لیکن بستی میں گندگی پھیلانے والوں کا ہاتھ نہیں پکڑا ـــــ یا جیسے آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تمثیلاً بیان فرمایا کہ ایک کشتی میں کچھ لوگ عرشے پر سفر کر رہے تھے اور کچھ نچلی منزلوں میں تھے۔ نیچے والوں نے سوچا کہ اُوپر جاکر سمندر سے پانی لینے کا کھکھیڑ اٹھانے کی بجائے کیوں نہ ہم کشتی کے پیندے میں سوراخ کرلیں اور وہاں سے پانی لے لیا کریں، تو سوچو کہ اگر انہیں اس سے نہ روکا گیا اور اس کے نتیجے میں کشتی غرق ہوئی تو صرف وہی نہیں ڈوبیں گے جنھوں نے سوراخ کیا تھا، بلکہ سب ہی ڈوب کر رہیں گے۔ یہی معاملہ انسانی معاشرے کا ہے کہ اُس میں اگر اہلِ خیر 'امر بالمعروف' اور 'نہی عن المنکر' کا فریضہ سرانجام نہ دیں اور اُس کے باعث معاشرے میں عام اخلاقی زوال رُو نما ہو جائے تو اُس کے اثرات سے وہ لوگ بھی نہ بچ سکیں گے جو انفرادی نیکی اور ذاتی تقویٰ پر کاربند رہے ہوں۔ بلکہ فتنہ جب ظاہر ہوگا تو اُس کی لپیٹ میں بالآخر پورا معاشرہ آکر رہے گا ـــــ یہاں تک کہ اللہ بھی سزا سے مستثنیٰ رکھتا ہے صرف ان لوگوں کو جو انفرادی صلاح و فلاح کے ساتھ ساتھ خیر کو پھیلانے اور بدی کی راہ روکنے کی مقدور بھر سعی کرتے رہے ہوں ـــــ اور وہ لوگ عذاب کی لپیٹ میں آکر رہتے ہیں جو خواہ خود کتنے ہی نیک رہے ہوں لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی سے پہلو تہی کریں۔ یہ معاملہ نہایت دہلا دینے والے انداز میں بیان ہوا ہے۔ ایک حدیثِ نبوی میں آیا ہے جسے امام بیہقیؒ نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے کہ آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "اَوْحَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰى جِبْرِیْلَ عَلَیْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِیْنَةَ كَذَا وَكَذَا بِاَهْلِهَا!" (یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل کو حکم دیا کہ فلاں اور فلاں آبادیوں کو اُن کے رہنے والوں سمیت اُلٹ دو!) ـــــ "قَالَ فَقَالَ اِنَّ فِیْهَا عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ یَعْصِكَ طَرْفَةَ عَیْنٍ!" (حضورؐ نے فرمایا کہ حضرت جبرئیل نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا کہ ان میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے پلک جھپکنے کی دیر میں بھی معصیت میں بسر نہیں کی!) ـــــ "قَالَ فَقَالَ اقْلِبْهَا عَلَیْهِ وَعَلَیْهِمْ فَاِنَّ وَجْهَهٗ لَمْ یَتَمَعَّرْ فِیَّ سَاعَةً قَطُّ!" (حضورؐ نے فرمایا کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اُلٹ دو اِن بستیوں کو پہلے اس پر اور پھر

دوسروں پر، اِس لئے کہ اُس کے چہرے کی رنگت میری غیرت وحمیت کے باعث کبھی متغیر نہیں ہوئی!) اللہ اکبر!! ـــــ وَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْد! مقامِ عبرت ہے کہ ایسا عابد و زاہد اور متقی و پرہیزگار انسان جس کی نیکی یا کیبازی کی گواہی اتنے شاندار الفاظ میں حضرت جبرئیلؑ نے بارگاہِ خداوندی میں دی اُس کا اِس قدر عبرتناک انجام صرف اِس وجہ سے ہوا کہ اُس نے اپنی ذاتی نیکی ہی کو کافی سمجھا اور احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے فریضے سے جان چُرائی ـــــ آیتِ زیرِ درس کے الفاظ نہایت جامع ہیں کہ ڈرو اور بچو اُس فتنے سے جو جب ظاہر ہوتا ہے تو اُس کی لپیٹ میں صرف وہی لوگ نہیں آتے جو عملاً بدلیوں اور بدکاریوں میں مبتلا رہے ہوں بلکہ اُس میں بسا اوقات گیہوں کے ساتھ گھن بھی پیس جایا کرتا ہے۔ اور اُس سے بچاؤ کی واحد صورت یہ ہے کہ اہلِ ایمان اپنی جملہ اجتماعی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے دل وجان سے آمادہ اور ہمہ تن مصروف ومشغول ہیں اور اس ضمن میں جب بھی دین کی جانب سے پکارا جائے، لبیک کہتے ہوئے حاضر ہو جائیں اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی بھرپور توفیق عطا فرمائے!!

۴۔ چوتھی اور آخری تنبیہ ہے: "وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝" اچھی طرح جان لو کہ اللہ جہاں اپنی انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں امکان بھر سعی کرنے والوں کے حق میں غفور اور رحیم بھی ہے اور رَءُوف و ودود بھی وہاں ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود جان و مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے جی چُرانے والوں کے حق میں "عَزِیْزٌ ذُوانْتِقَام!" بھی ہے اور: "شَدِيْدُ الْعِقَاب!" بھی! اور اللہ کی اس عقوبت کا ظہور آخرت میں تو ہونا ہی ہے، اِس دُنیا میں بھی ہوتا ہے اور جب اس دُنیا میں عذابِ الٰہی کے کوڑے برستے ہیں تو اُن کی زد میں کھلے کھلے کافروں اور منکروں کے ساتھ ساتھ وہ بھی آجاتے ہیں جو زبان سے تو ایمان کا دعویٰ کرتے ہوں۔ لیکن اللہ اور اُس کے رسول کی جانب سے نفیرِ عام کے اعلان کے باوجود جان و مال کو بچانے کی فکر میں لگے رہیں ـــــ!!

الغرض ـــ! یہ ہیں وہ چار تنبیہات جو اِن دو آیتوں میں پے بہ پے وارد ہوئی ہیں مبارک ہیں وہ جو اُن سے سبق حاصل کریں اور دین کی جانب سے عائد شدہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں کی ادائیگی پر کمربستہ ہو جائیں ؂

مقالات

چھٹی سالانہ

قرآن کانفرنس

منعقدہ: آئی۔ بی۔ اے ہال کراچی

۲۲ تا ۲۵ مارچ ۷۹ء

زیر اہتمام مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ناظم کانفرنس: قاضی عبدالقادر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

General M. Zia-ul-Haq

Chief of the Army Staf
Chief Martial Law Admini
Rawalpindi

قرآن کانفرنس، کراچی کیلئے

صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق کا

پیغام

(۲۲ مارچ ۱۹۷۹ء)

مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی ہے کہ انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام کراچی میں چھٹی قرآن کانفرنس کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح کی ایک کانفرنس گذشتہ سال بھی لاہور اور کراچی میں منعقد ہوئی تھی اور بہت مفید ثابت ہوئی تھی۔ مجھے اُمید ہے کہ ان شاء اللہ اس سال بھی یہ کانفرنس اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ آمین!

قرآنِ حکیم رشد و ہدایت کا مکمل اور ابدی ذخیرہ ہے اس نے بنی نوع انسان کو ایک ایسا طرزِ زندگی بخشا ہے جو اس کی مادی، سماجی اور رُوحانی ضروریات کو بڑے احسن طریقے سے پورا کرتا ہے۔ اس نظریے کے قابلِ عمل اور باعث نجات ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ رسُولِ مقبول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خود اسے اپنی زندگی میں رائج کیا اور عملاً ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جو تمام برائیوں سے پاک تھا۔

ابتدائے آفرینش سے انسان ایک ایسے ضابطۂ حیات کا متلاشی رہا ہے جو اسے دنیوی اور دینی نجات کی راہ دکھا سکے۔ اسی تلاش میں وہ کبھی ایک نظریے کی طرف پلٹا اور کبھی دوسرے کی طرف لیکن اسے اپنے درد کا کوئی مداوا نہ مل سکا۔ مادیّت کے اس دور میں بھی انسان متضاد نظریات کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا ہے اور اسے راہِ نجات دکھائی نہیں دیتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن حکیم کی ہدایت کو عام کیا جائے اور بھٹکے ہوئے انسانوں کو روشنی مہیّا کی جائے۔ قرآن کانفرنس اس مقصد کی طرف ایک مفید اور اہم قدم ہے۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر اسرار احمد اور ان کے رفقاء کو اس مشن میں کامیاب فرمائے۔ آمین

قرآن حکیم اور تزکیۂ نفس

از حضرت مولانا سیّد زوّار حسین نقشبندی

جنہوں نے چھٹی سالانہ قرآنک کانفرنس کی ایک نشست کی صدارت فرمائی

محترم اہلِ علم و دانش اور معزز حاضرین!

یہ محض ایک انکسار نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ یہ عاجز اپنی کم علمی و بے بضاعتی کے باعث خود کو اس کا اہل نہیں پاتا کہ آپ جیسے صاحبانِ علم و فضل کی محفل میں بولنے کی جرأت کر سکے اور اس بات کو اپنے لئے بے حد عزّت افزائی کا باعث سمجھتا ہے کہ اس عاجز کو اس بابرکت جلسے میں حاضر ہونے اور کچھ کہنے کا موقع عنایت فرمایا۔ اس لئے معذرت کے ساتھ کچھ عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں اس اُمید کے ساتھ کہ آپ حضرات میری کوتاہیوں اور غلطیوں سے چشم پوشی فرمائیں گے۔ آپ حضرات نے آج کے اس اجلاس میں اخلاقی و روحانی مسائل اور قرآنِ حکیم کے موضوع پر اہلِ علم و دانش کی تقریریں سُنیں اور اُن کے حکیمانہ و فاضلانہ خیالات سے استفادہ کیا۔ اِس میں شک نہیں کہ قرآن مجید کے معارف و حِکَم اہلِ علم و دانش اور اکابرِ ملّت ہمیشہ بیان کرتے رہے ہیں اور بیان کرتے رہیں گے، لیکن اس کے معارف کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے رسول! آپ فرما دیجئے، اگر میرے ربّ کی باتیں لکھنے کے لئے سمندر روشنائی ہو جائیں تو قبل اس کے کہ میرے ربّ کی باتیں پوری ہوں، سمندر ختم ہو جائیں گے، اگرچہ ہم اس سمندر کے مثل ایک دوسرا سمندر مدد کے لئے لے آئیں۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ نے خوب کہا ہے،

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم ❊ وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم

دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر ❊ ما ہم چناں در اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم

بایں ہمہ ان اکابر مقررین نے ہم سب کے سامنے جن قیمتی خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ ہمارے لئے ایک بے بہا سرمایہ ہے۔ ان حضرات کے بعد مجھ جیسے کم علم اور بے بضاعت کا لب کشائی کرنا تحصیلِ حاصل اور آفتاب کو چراغ دکھانا ہے، من آنم کہ من دانم۔

چونکہ آپ حضرات نے اس عاجز کو موقع دیا ہے، اس لئے اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کررہا ہے۔ انسان دو جوہروں سے مرکب ہے - ایک جوہر عُلوی ہے اور دوسرا سفلی، جس طرح سفلی جوہر یعنی مادّی جسم جو عناصرِ اربعہ سے مرکب ہے۔ صحت و مرض قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے - اسی طرح علوی جوہر یعنی روح کو بھی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں، جس طرح جسمانی امراض کے معالج اور ادویہ ہیں اسی طرح امراض روحانی کے بھی معالج اور نسخے ہیں۔ جس طرح ظاہری امراض کے معالج اطبّا ہیں، باطنی امراض کے معالج انبیاء کرام علیہم الصّلوٰۃ والسّلام اور ان کے جانشین علمائے کرام، اور اولیائے عظام ہیں۔ قرآنِ حکیم شفا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس میں لوگوں کیلئے شفا ہے۔ یہ باطنی امراض کے لئے بھی نسخے اور ہدایات پیش کرتا ہے اور ظاہری امراض کا بھی تدارک کرتا ہے - یہ روحانی ترقی کے لئے مکمل ہدایت نامہ اور اخلاقی اوضاع و اطوار کے لئے جامع منشور ہے - یہ ایک ایسا صحیفۂ حکمت ہے جو انسانی زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبے کے لئے سعادت و رحمت ہے۔ اُس کی اخلاقی تعلیمات دینی و دُنیوی زندگی کی صحت و سلامتی کی ضامن ہیں اور اُس کی روحانی تعلیمات اُخروی زندگی کی کامیابی و سرخروئی کی کفیل ہیں۔ یہ رُوحانی سربلندی کی اساس اور حسنِ اخلاق کی تکمیل کا مکمّل لائحۂ عمل ہے۔ یہ روحانی معراج کے لئے ایک کامل ترین نسخۂ کیمیا اور اخلاقی سربلندی کیلئے ایک نہایت معتمد وسیلہ ہے ؂

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں نبی آخر الزّمان، سرورِ کائنات صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم کی بعثت کے جو تین اہم مقصد بیان فرمائے ہیں، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم اُن کو قرآن مجید کی آیات پڑھ کر سُناتے ہیں - دوسرا یہ کہ اُن کا تزکیہ فرماتے ہیں - اور تیسرا مقصد یہ کہ کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں ؂

آج کی اس مجلس میں جس مقصدِ بعثت کا بیان ہوا وہ تزکیہ یعنی اخلاقی، اور روحانی اصلاح ہے - حضورِ انور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ گرامی ہے کہ مجھے اللہ تعالےٰ نے دُنیا میں اس لئے بھیجا ہے کہ میں اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں - آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت سے قبل دنیا کی حالت ناگفتہ بہ تھی، آپؐ سے پہلے نبی حضرت عیسیٰ علیٰ نبیّنا وعلیہ الصّلوٰۃ والسلام کو مبعوث ہوئے چھ صدیاں گذر چکی تھیں - تمام نوعِ انسانی

پیغمبروں کی تعلیم کو فراموش کر چکی تھی، مظاہر پرستی کا دور دورہ تھا، چاند، سورج، ستاروں، سیاروں، انسانوں، حیوانوں، شجر و حجر، خاک و آب و آتش وغیرہ کی پرستش عام تھی۔ اگر کوئی اللہ کی عبادت کرتا بھی تھا تو دوسروں کے واسطے سے کرتا تھا اور کہتا تھا کہ ہم ان کو صرف اس لئے پوجتے ہیں تاکہ یہ اللہ کی طرف ہماری قربت کا ذریعہ بن جائیں۔ ظلم و ستم کی آندھیاں اُمڈی ہوئی تھیں، رسم و رواج اور شرک و بدعت کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ایسے تاریک زمانے میں جب اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو آپؐ نے کائنات کی کایا پلٹ دی، اُن کو گمراہی کے گڑھے سے نکال کر ترقی و اصلاح کی بلندی پر فائز کرایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قرآن حکیم ایک ایسی جامع و اکمل کتاب عطا فرمائی جس میں حکمت و اخلاق کی کامل ترین تعلیم موجود ہے۔

آں سرور علیہ الصلوٰۃ والسلام آخری نبی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ آپؐ خاتم النبیین ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میرے بعد کسی قسم کا کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس لئے آپؐ کی کتاب قرآنِ حکیم بھی آخری کتاب ہے اور ہر لحاظ سے جامع و اکمل ہے۔ قرآن حکیم نے انسان کی اخلاقی و روحانی اصلاح اور تزکیۂ باطن کے لئے جو رہنما اصول بیان فرمائے ہیں، وہ قیامت تک ہر خطۂ زمین کے لوگوں کیلئے مکمل اور نتیجہ بخش ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تمہارے لئے اللہ کے رسول میں اُسوۂ حسنہ ہے۔ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ نوعِ انسانی کے لئے بہترین نمونہ ہے۔ آپؐ نے کوئی روحانی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس کی ہمیں تعلیم نہ دی ہو اور عملی طور پر اسے کر کے نہ دکھایا ہو۔ آپ کا اُسوۂ حسنہ قرآن مجید کے عین مطابق تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا تو آپ نے جواب میں فرمایا قرآنِ پاک آپ کا اخلاق تھا، آپ نے جو روحانی و اخلاقی تعلیم امت کو دی ہے، اُس کا ایک ایک عمل انسان کی روحانی معراج ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مشہور حدیث ہے، جس میں بیان ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے انسانی شکل میں حاضر ہو کر آپ سے چند سوالات دریافت کئے اور آپ نے اُن کے جواب مرحمت فرمائے، کیونکہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین غایتِ ادب کے باعث

آپ سے مسائل دریافت کرنے میں شرماتے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیلؑ کو انسانی شکل میں بھیج کر اُن کی تعلیم کا انتظام فرمایا۔ ان سوالات میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ یا رسول اللہ! یہ فرمائیے کہ احسان کیا چیز ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ پس اگر تو اللہ کو نہیں دیکھ رہا تو بلاشبہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ آپؐ کے یہ کلمات کتنے جامع ہیں کہ جن میں آپ نے تمام روحانی و اخلاقی تعلیم کو سمو دیا ہے۔ کیونکہ جب یہ تصوّر قائم ہو جائے گا کہ گویا ہم اللہ کو دیکھ رہے ہیں تو ہمارا ہر قول و فعل خالص اللہ کے لئے ہوگا اور اس کی مرضی کے مطابق اور اُس کی خوشنودی کے لئے ہوگا۔ کیونکہ جب کوئی نوکر یا غلام یہ جانتا ہے کہ اُس کا مالک سامنے موجود ہے، اور وہ اپنے مالک کو دیکھ رہا ہے تو وہ ہر کام کو صحیح طریقے پر اخلاص اور تندہی سے کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ تصوّر ہونا کہ ہم اس کو دیکھ رہے ہیں، عملاً ایک مشکل امر ہے اور عوام الناس کو یہ مقام حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تو ایسا نہ کر سکے تو یہ تصوّر کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے کیونکہ وہ تو ضرور حاضر و ناظر ہے۔ جب یہ تصوّر کرے گا تو اس کے ہر فعل میں کافی حد تک اخلاص آجائے گا، اور ریاکاری سے بچ جائے گا۔ کیونکہ جب کوئی نوکر یا غلام یہ سمجھتا ہے کہ اگرچہ وہ اپنے مالک کو نہیں دیکھ رہا، لیکن اس کا مالک ضرور اُس کو دیکھ رہا ہے، تب بھی وہ اپنے مالک کے خوف سے کام کو اچھی طرح کرتا ہے، اگرچہ اس کے کام میں پہلے درجے جیسا اخلاص تو نہیں ہوگا، لیکن ریاکاری سے بہت حد تک بچ جائے گا۔ وہ کام کو بیگار کے طور پر نہیں کرے گا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ایک ایسا جامع و مکمل نسخہ تعلیم فرمایا ہے جس پر عمل کرنے سے اعمال میں اخلاص پیدا ہونے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ اخلاص کا کامل درجہ بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اس کو یہ بات بھی حاصل ہو جاتی ہے کہ گویا وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ گویا اس حدیث کا پہلا جزو صوفیائے کرام کی اصطلاح کے مطابق جذبہ کا مظہر ہے اور دوسرا جزو سلوک کا مظہر ہے۔ واللہ اعلم!۔۔۔ رضائے الٰہی حاصل کرنے کیلئے سب سے پہلے انسان کو اللہ تعالیٰ کے احکام کا علم ہونا ضروری اور اوامر و نواہی کا

جاننا ناگزیر ہے۔ جس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مقصدِ بعثت کتاب و حکمت کی تعلیم دینا ارشاد ہوا ہے۔ اس کے بعد کتاب و حکمت کی تعلیم پر عمل کرنا یعنی اوامر کو بجا لانا اور نواہی سے اجتناب کرنا ضروری ہے، جس کو تزکیہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ کیونکہ یہ ظاہری اعمال باطنی و روحانی اصلاح کا ذریعہ ہیں، اس لئے ان پر عمل کرنے سے چارہ نہیں ہے۔ تزکیۂ ظاہر و باطن کا کمال یہ ہے کہ ہر عمل میں اخلاص ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دینِ خالص اور اخلاص والا عمل ہی معتبر اور قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اسی اخلاص فی الاعمال کو مذکورہ حدیث شریف میں احسان سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور اخلاص کا کمال یہ ہے کہ اپنے کسی عمل میں بھی اخلاص نہ سمجھے اور اس کو باری تعالیٰ کی بارگاہِ مقدس کے لائق نہ جانے، یہ بات اس وقت حاصل ہوگی جب حدیثِ احسان کے پہلے جزو پر عمل حاصل ہو جائے یعنی یہ کیفیت حاصل ہو جائے کہ گویا وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے اور اُس کے لئے پہلے اس بات کا مراقبہ کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے۔ اور اس کے لئے ایسے بزرگوں کی صحبت اختیار کرنی ہوگی جو احسان کے اس درجے پر فائز ہو چکے ہوں گے۔ جس طرح آنحضور سرورِ کائنات کی صحبتِ بابرکت کے فیضان سے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا تزکیہ ہوا اور یہ حضرات احسان کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہوئے۔ اسی طرح صحابۂ کرام کی صحبت کے فیضان سے تابعین اور تابعین کی صحبت سے تبع تابعین کا تزکیہ ہوا۔ اور یہ حضرات اخلاقی اور روحانی معراج کے اعلیٰ و ارفع مقام تک پہنچے اور اس طرح یہ روحانی و اخلاقی اصلاح کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ رہتی دُنیا تک جاری رہے گا۔ اِس میں شک نہیں کہ قرآنِ حکیم تمام روحانی و اخلاقی مسائل کا مکمل حل ہے اور کوئی روحانی و اخلاقی مسئلہ ایسا نہیں جس کا حل ہمیں قرآنِ حکیم سے باہر تلاش کرنے کی ضرورت پڑے۔ لیکن جس طرح اُس کے ظاہری احکام کے لئے ہمیں علمائے کرام کی طرف رجوع کرنے اور اُن سے رابطہ قائم رکھنے کی ضرورت ہے، اسی طرح ہمیں اپنے اخلاقی و روحانی مسائل کو قرآنِ حکیم کے مطابق حل کرنے، اور اپنے آپ کو اخلاقِ قرآنی کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے روحانی پیشواؤں اور مقامِ احسان سے مشرف ہونے والے بزرگوں کی صحبت اختیار کرنا اور خود کو اُن کی تعلیمات پر چلانا ناگزیر ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے خوب کہا ہے ؎

(بقیہ صفحہ ۴۹ پر دیکھیں!)

اخلاقِ حسنہ اور قرآن

از

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

۱- اسلام نے اخلاقِ حسنہ پر بہت زور دیا ہے، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو یہ فرماتے ہیں: بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ ط (یعنی میری بعثت کی غرض ہی یہ ہے کہ میں بہترین اخلاق کی تکمیل و تتمیم کروں!) آپؐ خود اخلاقِ حسنہ کا زندہ نمونہ تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ط (اور آپؐ بیشک خلقِ عظیم پر پیدا ہوئے ہیں!)

چنانچہ آپؐ نے مبعوث ہوتے ہی اس فرض کی تکمیل شروع کر دی تھی۔ آپؐ ہمیشہ صحابہؓ کو مکارمِ اخلاق کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ آپؐ کا ارشاد ہے: اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا۔ (یعنی ایمان میں کامل وہ شخص ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں!) اگر غور سے دیکھا جائے تو قرآن مجید علمِ اخلاق کی ایک حکیمانہ کتاب بھی ہے۔ اس میں انسانی زندگی کی تہذیب و شائستگی کے ہر پہلو پر اور ہر شعبے پر بحث کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ قوم اور فرد کی زندگی کے لئے کس قسم کے آداب اور اخلاق کی ضرورت ہے۔ اخلاق کے بنیادی اُصول کیا ہیں؟ اُن کا فلسفہ کیا ہے؟ ان کا ماخذ اور مرجع کیا ہے؟ اُن میں کن کن اسباب سے ترقی ہوتی ہے، اُن اخلاقِ حسنہ کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟ قرآن نے وہ تمام ذرائع بھی تلقین فرمائے ہیں جن سے افراد کا کردار درست ہو سکتا ہے اور وہ اس قابل ہو سکتے ہیں کہ نظامِ قومی میں حصہ لے سکیں۔ غرض قرآن نے اخلاق، فلسفۂ اخلاق اور شخصی و قومی اخلاق پر مفصل بحث کی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ سارا قرآن از اوّل تا آخر اخلاقی تعلیمات سے بھرپور ہے۔ وہ ایک مکمل ضابطۂ اخلاق ہے، جس کی نظر

انسانی ہستی کے پورے نظام پر ہے - اور اُس کے نفاذ میں اس نے وسیع ہمہ گیر مفصل مکمل اور جامع دفعات کا لحاظ رکھا ہے - اُس میں تمام اخلاقی احوال اور کیفیات کا احاطہ کر لیا گیا ہے - اس نے بتایا کہ انسان کے فعل اور ترکِ فعل کی اندرونی اور ذاتی سبیلیں کیا ہیں ؟ اور کن باطنی محرکات سے ظاہری افعال کا وقوع ہوتا ہے ؛

افعال کی تنقید و تشخیص عملی رنگ میں کن اصولوں کے تابع ہے ؟ خصائل کے نشو و نما کے طریقے اور عادات کے سلسلے کیا ہیں ؟ افعال اور جذبات میں کیا نسبت ہے ؟ جذبات کو روکنے کے کیا اُصول ہیں ؟ جذبات کا اعمال پہ کیا اثر مرتب ہوتا ہے ؛

قرآن نے انسانی زندگی کے ہر شعبے میں اخلاقی طاقتوں کو تسلیم کیا ہے - اگر اس کے ضابطۂ اخلاق کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں انفرادی اخلاق، اجتماعی اخلاق یعنی عائلی اخلاق، تمدنی اخلاق، سیاسی اخلاق، جنگی اخلاق، قومی اخلاق، بین الاقوامی اخلاق، قانونی اخلاق، سیاسی اخلاق، معاشی اخلاق، علمی اخلاق، تعلیمی اخلاق وغیرہ کی ایک وسیع الذیل دنیا سمائی ہوئی ہے - اخلاقی اقدار کے بحرِ ناپیدا کنار کو قرآن نے اسلامی ضابطۂ اخلاق کے کوزے میں بند کر دیا ہے - اسی لئے قرآن سے ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں اخلاقی رہنمائی مل سکتی ہے - انسان کی اخلاقی اور نفسیاتی کیفیات، حالات، حقوق، فرائض، فضائل اور آداب کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو قرآن کی اخلاقی تعلیمات سے باہر رہ گیا ہو، اور اس کی وجہ میری رائے میں یہ ہے کہ قرآن دُنیا میں آخری پیغامِ ہدایت ہے - لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ساری قوموں اور ساری اُمتوں کو قیامت تک کے لئے کامل اور مکمل ضابطۂ اخلاق عطا کر دیا ہے - اور قرآنی ضابطۂ اخلاق کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں تمام کُتبِ سابقہ اور ادیانِ عالم کی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات نہایت دلنشیں انداز میں جمع کر دی گئی ہیں - قرآن خود کہتا ہے کہ میں تمام سابقہ الہامی کتابوں کا مُصدِّق ہوں - مثلاً افلاطون، جو آپؐ سے بارہ سو سال پہلے گذرا ہے، لکھتا ہے کہ بنیادی نیکیاں CARDINAL-VIRTUES - چار ہیں - (۱) WISDOM, (۲) COURAGE, (۳) TEMPERENCE (۴) AND JUSTICE - حکمت، شجاعت، عفّت اور عدالت —— چنانچہ قرآن مجید نے بھی ان چاروں اُصولی اور بنیادی نیکیوں کو اپنے ضابطۂ اخلاق میں نمایاں

بگہ دی ہے ÷

اسلام کا قانونِ اخلاق اُن لوگوں کے لئے جو نیک ہیں، ترقّی کا ایک بڑا ذریعہ ہے جو رُوحانی منزلیں طے کرنا چاہتے ہیں اُن کے لئے زبردست رہنما ہے اور جو لوگ با اخلاق بننا چاہتے ہیں اُن کا دوست ہے۔ ÷

قرآن مجید کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے قوانین تحکمانہ طور پر نہیں منواتا بلکہ اُن کے ساتھ اُن کی مصلحتیں اور خوبیاں اور اُن کے فوائد بھی بیان کرتا ہے اور اُن کی صحت و صداقت پر دلائل بھی دیتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ تجربے اور مشاہدے سے اُن قوانین کی صحت اور صداقت واضح ہو سکتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ میرے عطا کردہ ضابطۂ اخلاق پر عمل کر کے دیکھ لو، اس کی خوبی، عمدگی اور افادیت خود بخود تم پر واضح ہو جائے گی ÷

یعنی مذہب کی دنیا میں قرآن پہلی کتاب ہے جس نے دنیا کو PRAGMATIC-TES- کی دعوت دی۔ یعنی آؤ میری تعلیمات پر عمل کر کے دیکھ لو۔ تمھارے اندر صفاتِ ایزدی کا رنگ نہ جھلکنے لگے تو میرا ذمّہ! یہاں اس بات کی صراحت نامناسب نہ ہوگی کہ قرآنی ضابطۂ اخلاق کی نمایاں خصوصیات حسبِ ذیل ہیں:

۱- اُس کی بنیاد وحیٔ الٰہی پر ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے نہ کہ رسول اللہ کا۔

۲- وہ قابلِ عمل ہے۔ ÷

۳- وہ ہر زمانے اور ہر قوم کے لئے کار آمد ہے۔ ÷

۴- وہ PRACTICABLE قابلِ عمل ہے۔ ÷

۵- وہ انتہائی ارفع نصب العین عطا کرتا ہے۔ قرآن کا ETHICAL-IDEAL- یہ ہے کہ اپنے اندر اللہ کی صفات کی جھلک پیدا کرو ÷

۶- وہ ہمہ گیر بھی ہے، عالمگیر بھی ہے ÷

۷- اُس میں ہر حالت، ہر زمانے اور ہر ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت مخفی ہے۔

۸- وہ بیک وقت فرد اور جماعت دونوں کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

۹- وہ مطلق ABSOLUTE ہے۔ کوئی انسان اس پر اضافہ نہیں کر سکتا ÷

یہ تمام خصوصیات ایسی ہیں کہ ہر خصوصیت پہ ایک مستقل مقالہ لکھا جا سکتا ہے ؎

دامانِ نگہ تنگ و گُلِ حُسنِ تو بسیار ❖ گل چینِ بہارِ تو زداماں گلہ دارد

فلسفۂ اخلاق کا بنیادی سوال یہ ہے کہ اخلاق کا مبدأ اور ماخذ کیا ہے؟ —

قرآن بتاتا ہے کہ انسان کی طبعی حالتیں جن کا سرچشمہ نفسِ اَمّارہ ہے، انسان کی اخلاقی حالتوں سے الگ نہیں ہیں، بلکہ وہی حالات ہیں جو تربیت سے اخلاقی حالت کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ جس قدر اُصولِ اخلاق ہیں وہ سب جذباتِ فطرت ہی کے اثرات ہیں اور فطرت ان سب کا ماخذ ہے۔ اخلاق کا مبدأ اور مخزن، انسان کی اپنی طبیعت اور اس کی فطری حالت ہے۔ نیز اسلام نے بتایا کہ انسان کی فطرت بد یا بُری یا مذموم نہیں ہے۔ وہ اپنی خلقت کے لحاظ سے پاک ہے۔ انسان کی اصل فطرت میں ہدایت اور صحیح الہام ودیعت ہے اور اُسے احسنِ تقویم پر پیدا کیا گیا ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ نیز ارشادِ نبویؐ ہے: مَا مِنْ مَّوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْ یُنَصِّرَانِہٖ اَوْ یُمَجِّسَانِہٖ۔ یعنی ہر انسان اپنی اصل کے لحاظ سے معصوم اور بے داغ پیدا ہوتا ہے۔ یہاں حضورؐ نے عیسائیوں کے موروثی گناہ کے عقیدے کی تردید فرما دی۔

اسلام نے ہمیں بتایا ہے کہ انسان کے طبعی قواء (قویٰ) جب حدِّ صلاحیت میں رہ کر کام کرتے ہیں تو اس عمل کا نام اخلاقِ حسنہ ہے۔ واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اخلاق کا ملکہ ہمارے اندر ودیعت کر دیا ہے اور اپنے ارادے اور صحیح تربیت سے ہم اسے لغزشوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ اس بات سے اسلام کی اخلاقی تعلیم کے دو نکتے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ طبعی جذبات کو کچل دینا کوئی خوبی نہیں ہے۔ اسی لئے تو ترکِ دُنیا یا رہبانیت کوئی خوبی نہیں ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے: —— وَرَھْبَانِیَّۃَ نِ ابْتَدَعُوْھَا مَا کَتَبْنٰھَا عَلَیْھِمْ (۵۷-۲۷)۔ اسی لئے حضورؐ نے فرمایا: لَا رَھْبَانِیَّۃَ فِی الْاِسْلَامِ ۝

اسلام نے بتایا کہ کوئی قوّت فی نفسہا بُری نہیں ہے بلکہ وہ موقع اور محل کے خلاف استعمال سے بُری ہو جاتی ہے۔ قرآن نے غصّے کو ضبط کرنے والے کی تعریف کی ہے غصّے کو مٹا دینے والے کی نہیں۔ اسی طرح اسلام کہتا ہے کہ کوئی جذبہ فی نفسہٖ بُرا نہیں ہے

انسان میں شہوت اور غضب دو زبردست قوّتیں ہیں۔ اسلام کہتا ہے : ـــــــ
DO NOT KILL THEM; RATHER CONTROL THEM.
انہیں مت فنا کرو یہ تو رہبانیّت ہو جائے گی بلکہ انہیں اپنے کنٹرول میں (قابو میں) رکھو یعنی قرآن نے تمام فطری ملکات کی تہذیب و تعدیل اور تربیت کا حکم دیا ہے ؁
دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ قوائے طبعی اس وقت اخلاق کا رنگ اختیار کرتے ہیں۔ جب ان کے ساتھ ارادہ اور نیّت بھی شامل ہو۔ چنانچہ بخاری کا آغاز ہی اس حدیث سے ہوتا ہے : إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ۔ انسان کے اعمال کا حُسن و قبح نیّت پر موقوف ہے ۔ یعنی اخلاق کا اچّھا یا بُرا ہونا انسان کی نیّت یا ارادے پر موقوف ہے۔ حُسنِ نیّت نہ ہو تو بڑے سے بڑا اخلاقی فعل بھی حُسنِ خلق کے دائرے سے باہر نکل جاتا ہے جس فعل میں نیک ارادہ شامل نہیں وہ اخلاقی لحاظ سے بےقیمت ہے۔ اسلام میں نفسِ عمل یا مطلق عمل مطلوب نہیں بلکہ وہ عمل مطلوب ہے جو نیک نیّت پر مبنی ہو۔ دراصل نیک نیّت اسلام میں ایک ایسا فرض ہے جو ہر حالت میں قابلِ عمل ہے اور تمام اوصافِ حسنہ کے لئے سنگِ بنیاد ہے۔ اسلام میں کوئی فعل اس وقت تک مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک اُس کے کرنے والے کی نیّت نیک درست اور پاک نہ ہو ؁

اسلام نے ان اسباب سے بھی ہمیں آگاہ کیا ہے جن کی وجہ سے انسان بد اخلاقی میں مبتلا ہو جاتا ہے مثلاً :

(ا) بُری صحبت : چنانچہ اِس سے بچنے کے لئے فرمایا : كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ۝
یعنی سچّوں کی سنگت اختیار کرو ؁ (سورت ۱۱۹ ، آیت ۹)

(ب) دوسرا سبب جسمانی یا ذہنی بیماری ہے ۔ چنانچہ حضورؐ نے ان سے اجتناب کا حکم دیا اور فرمایا کہ " قوی اور امین مومن ایک ضعیف مومن سے بہتر ہے ؁

(ج) تیسرا سبب ماحول کی خرابی ہے ، اُس کے ازالے کیلئے فرمایا " قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا ط (۶۶-۰۰)

(د) چوتھا سبب جہالت، بے علمی اور بے خبری ہے ۔ اس کے ازالے کے لئے اسلام (قرآن و حدیث) نے مکمّل ضابطۂ اخلاق پیش کیا ہے اور اُصولی

طور پہ بتایا ہے کہ تمام اخلاقِ حَسَنہ دراصل اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ کا پرتو ہیں اور صفاتِ الٰہیہ کا ظل ہیں۔ چنانچہ حضورؐ فرماتے ہیں: "حَسَنُ الْخُلُقِ، خُلُقُ اللّٰہِ الْاَعْظَمُ" یعنی خوش اخلاقی اللہ تعالیٰ کا خلقِ عظیم ہے یعنی وہی اخلاق اسلامی لحاظ سے اچھے قرار دیئے جائیں گے، جن میں صفاتِ ایزدی کا رنگ جھلکتا ہو، اسی لئے حضورؐ نے ارشاد فرمایا: "اے مسلمانو! اپنے اندر اللہ کی صفات اور اس کے اخلاقِ حسنہ پیدا کرو۔" یہ ارشاد قرآن کی اِس آیت کی تفسیر ہے: صِبْغَۃَ اللّٰہِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً ؕ (اے مسلمانو! کافروں سے کہہ دو کہ ہم نے تو اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگ لیا ہے، اور اُس کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہے!)

اسلام نے ہمیں حُسنِ اخلاق کی پرکھ کا ایک اور اُصول بھی بتایا ہے، جسے ہم ضمیر کی آواز کہہ سکتے ہیں۔ میں جب فرسٹ ایئر میں پڑھتا تھا (۱۹۱۲ء) تو میں نے ورڈز ورتھ کی ایک نظم پڑھی تھی، اُس کا پہلا مصرع ابھی تک یاد ہے:

STERN DAUGHTER OF THE VOICE OF GOD.

چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب کسی امر کا اچھا یا بُرا ہونا طے کرنا ہو تو اپنے دل سے فتویٰ طلب کرو اور یہ سمجھ لو کہ نیکی وہ عمل ہے جس کے کرنے کے بعد دل میں اطمینان کی کیفیت پیدا ہو اور بدی وہ عمل ہے جس کے ارتکاب کے بعد تمہارے دل میں کانٹا سا کھٹکنے لگے (مَا حَاکَ فِیْ نَفْسِکَ ؕ) واضح ہو کہ یہ آواز نیکی اور بدی کے فطری الہامات کے تابع ہے۔ چنانچہ اللہ نے فرمایا: فَاَلْہَمَہَا فُجُوْرَہَا وَتَقْوٰہَا ؕ (۹۱-۸)

نفسِ انسانی کو نیکی اور بدی کی پرکھ کا جو ملکہ عطا کیا گیا ہے، اُسی کو دوسری جگہ نفسِ لوّامہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی جب ہم کوئی بُرا کام کرتے ہیں تو ہمارا دل یا ضمیر ہمیں ملامت کرتا ہے، ہمارے اندر خجالت کا احساس پیدا ہوتا ہے، ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے یہ کام اچھا نہیں کیا۔ لیکن اگر ہم ضمیر کی اس آواز سے کوئی سبق نہ لیں تو رفتہ رفتہ یہ طاقت مردہ ہو جاتی ہے اور ہم کہتے ہیں کہ فلاں آدمی کا ضمیر مردہ ہو چکا ہے، اس لئے وہ برائی کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ ایک شریف آدمی، ایک چیونٹی کو بھی دیدا دانستہ کچلنا گوارا نہیں کرے گا۔ لیکن اسی دُنیا میں ایسے لوگ بھی بستے ہیں جو سینکڑوں کو بلا دریغ قتل کر دیتے ہیں اور انہیں ذرا بھی افسوس نہیں ہوتا۔ بداخلاقی سے بچنے کا

ایک بڑا ذریعہ صحیح تربیت ہے۔ اسی لئے حضور علیہ السّلام نے حکم دیا کہ جب بچّہ پیدا ہو تو اُس کے دائیں کان میں اذان دو اور بائیں کان میں تکبیر کہو۔ اور جب بچّہ سات سال کا ہو جائے تو اُسے نماز پڑھنے کا عادی بناؤ ؛

تربیت کا دوسرا ذریعہ تذکیر اور نصیحت بھی ہے، چنانچہ قرآن فرماتا ہے :۔ وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ ـــــــ تربیت کا تیسرا ذریعہ تاریخ ہے اور اخلاقی اعتبار سے تاریخ میں بڑی وسعت ہے اور اُس کی بڑی قدر و قیمت ہے۔ اسی لئے قرآن مجید نے اصلاحِ اخلاق کے لئے تاریخ کے مطالعے کی دعوت دی ہے اور اسی لئے قرآن نے اقوامِ ماضیہ کی تاریخ بیان کی ہے تاکہ ہم عبرت حاصل کر سکیں۔ تربیت اور اصلاح کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہمیں اپنے عیوب سے آگاہی حاصل ہوتی رہے، اسی لئے حضورؐ نے فرمایا کہ : حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا :۔ یعنی اس سے پہلے کہ قیامت میں تمھارا محاسبہ ہو، تم دُنیا ہی میں خود اپنا محاسبہ کر لو ؛

مکارمِ اخلاق میں سے کسی خُلق کو بھی پیدا کرنے کے لئے اسلام نے ریاضت اور مشق پر بہت زور دیا ہے۔ اخلاقِ حَسَنہ بآسانی پیدا نہیں ہو سکتے۔ اُن کے حصول کیلئے بڑی محنت اور ریاضت درکار ہے۔ اور اِس بات کو کون نہیں جانتا کہ کوئی اچھی صفت بغیر ریاضت حاصل نہیں ہو سکتی :

TO ACQUIRE ANY VIRTUE YOU HAVE TO BURN YOUR MIDNIGHT OIL .

انسان کی فطرت بھی عجیب ہے۔ بُرائی کی طرف نفسِ امّارہ بآسانی اور بہت جلد راغب ہو جاتا ہے۔ لیکن قیامِ لیل یا تہجّد کے لئے زبردست جدّ و جہد درکار ہوتی ہے ؛

غذاؤں کا بھی انسان کے اخلاق پر اثر پڑتا ہے، اسی لئے شریعت نے ہمیں حرام اور ناپاک اشیاء سے اجتناب کا حکم دیا۔ چنانچہ امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ بچّے کی دایہ نہایت دیندار اور صالحہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جو دودھ حرام سے بنے گا اس میں کوئی خیر یا برکت نہیں ہوگی ؛

اسلام نے اخلاقی تعلیمات کو رائج کرنے کے لئے متعدّد طریقے اور اسلوب اختیار کئے ہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں اخلاقِ حَسَنہ کو عمدہ تشبیہوں اور اخلاقِ رذیلہ کو

قابلِ نفرت صورتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اچھے اخلاق کے اچھے اور بُرے اخلاق کے بُرے نتائج واضح طور پر بیان کئے ہیں ۔

فرد اور قوم کی اصلاح کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے : اخلاق اور قانون۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ کسی نے ایک مسلمان صوفی سے پوچھا کہ وہ کیا طریقے ہیں جن سے ہم تمام منہیات اور بلیات سے طمانیت اور استقلال کے ساتھ آزاد ہو جائیں ؟ انہوں نے کہا اس کے حصول کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ ہے "ایمان باللہ" کیونکہ ایمان باللہ، اسلامی ضابطۂ اخلاق کا بنیادی پتھر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کی بدولت ہمارے اندر بُرائیوں سے اجتناب اور نیکیوں کے اکتساب کی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہم سچے دل سے اللہ پر ایمان لے آئیں تو ہم یقیناً نماز پڑھیں گے اور نماز میں اللہ نے یہ تاثیر رکھی ہے کہ وہ ہمیں فحشا اور منکرات اور بغاوت (نافرمانی یا سرکشی) سے روکتی ہے۔ اور جب ہم بُرائی سے بچتے ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں تو اللہ اپنے فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ بشارتیں دیں اور حوصلہ افزائی کریں :

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا (۴۱-۳۰)

آج کل بعض مسلمانوں میں یہ غلط خیال پیدا ہو گیا ہے کہ انکارِ باری تعالیٰ سے اخلاقِ حسنہ میں کسی قسم کا فتور پیدا نہیں ہوتا۔ میرا عقیدہ شروع یعنی جوانی سے یہی ہے کہ اگر ہمارا ایمان اللہ اور آخرت پر نہیں ہے تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اخلاقی زاویۂ نگاہ سے نیک اور پرہیزگار نہیں بنا سکتی۔ جس ضابطۂ اخلاق کے نسخے میں خدا پرستی بطور جزوِ اعظم شامل نہیں ہے، وہ ضابطہ اُس کاغذ کے پھول کی طرح ہے جس میں کوئی خوشبو نہ ہو ۔

ایمان باللہ کے بعد اخلاقِ حسنہ کے اکتساب کے لئے ایمان بالآخرت بھی اشد ضروری ہے۔ یعنی ہم جو کچھ اس دُنیا میں کریں گے تو آخرت میں ہمیں قانونِ مکافات کی رو سے ہمارے اعمال کے مطابق جزاء یا سزا ملے گی۔ اسی لئے شیخ سعدیؒ نے فرمایا : از مکافاتِ عمل غافل مشو ۔ گندم از گندم بروید، جَو ز جَو ——— اسلام

جب اخلاقِ حسنہ کی تحریک کرتا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی بتاتا ہے کہ اِن سے صرف تمدّن ہی نہیں سنورتا۔ بلکہ آئندہ زندگی بھی سنورتی ہے ؎

قرآنِ حکیم نے اخلاق کی درستی کے لئے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ ستودہ صفات کو بطورِ نمونہ اور اُسوہ پیش کیا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ط (۳۳-۲۱)

حضورِ انور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اسوۂ حسنہ کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو منازل سلوک طے کرنے میں بڑی سہولت پیدا ہوجاتی ہے اور اس بات پر تمام اربابِ کشف و شہود کا اجماع ہوچکا ہے ——— اسلام نے تربیت کے محلِ اثر کی تعیین بھی کردی ہے اور بتایا ہے کہ تربیت کا اصلی اثر قلب اور دماغ پر ہوتا ہے۔ اخلاقی ریاضتوں اور مجاہدات سے، سب سے پہلے قلب متأثر ہوتا ہے اور جب اُس کی اصلاح ہوجاتی ہے، جسے اصطلاح میں تصفیہ کہتے ہیں تو دوسرے اعضاء اور جوارح بھی درست ہوجاتے ہیں اور اس طرح انسان اخلاق کی بلندیوں پر فائز ہوجاتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ؐ نے فرمایا کہ جسمِ انسانی میں ایک مضغہ (پارۂ گوشت) ہے، اگر اُس کی اصلاح ہوجائے تو سارے جسم کی اصلاح ہوجاتی ہے اور اگر وہ فاسد ہوجائے تو سارا جسم فاسد ہوجاتا ہے، آگاہ ہوجاؤ کہ وہ مضغہ قلب ہے۔

صوفیائے کرام نے اپنے کشف اور مشاہدے سے دریافت کیا ہے کہ خدا کے مشاہدے کا آلہ قلب ہے جو ایک لطیفہ ہے۔ گناہوں سے اس پر زنگ لگ جاتا ہے: كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم۔ اور زنگ کی وجہ سے یہ لطیفہ اندھا ہوجاتا ہے، جس کا منطقی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خدا سے بیگانہ ہوجاتا ہے:—

وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ط (۲۲/۴۶)

یعنی اُن کی آنکھیں اندھی نہیں ہوجاتیں بلکہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔ اسی لئے مرشدِ رومیؒ نے نصیحت کی ہے:

آئینہ ات دانی چرا غماز نیست ⁂ زانکہ زنگار از رُخِ اُو پاک نیست

رَو تو زنگار از رُخِ اُو پاک کُن ⁂ بعد ازاں آں نور را ادراک کُن

اسی لئے اسلامی ضابطۂ اخلاق میں قلب کا تصفیہ عروجِ رُوحانی کے لئے شرطِ اولین ہے۔

اور یہ تو ہر عقلمند آدمی جانتا ہے کہ تصفیۂ قلب سے پہلے تزکیۂ نفس ضروری ہے جس طرح میٹرک پاس کئے بغیر کالج میں داخلہ نہیں مل سکتا ——— !!

قرآنِ حکیم نے علمِ اخلاق کا یہ اصول بھی بیان کیا ہے کہ نیکیوں میں یہ قوت ہے کہ وہ برائیوں کا ازالہ کر دیتی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے : اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ط (۱۱ — ۱۱۵) ——— کمزور انسان کے لئے اس آیت میں بڑی بشارت ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت (ساتویں صدی عیسوی میں) دُنیا کی مہذّب اور فلسفی مزاج قوموں میں خصوصًا ہندوستان، ایران اور یونان میں دو نظریے رائج تھے۔ ایک یہ کہ دُنیا سراسر بدی کا گھر ہے، انسان سے نیکی ہو ہی نہیں سکتی۔ اِس نظریے کو PESSIMISM کہتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے تینوں مذاہب — HINDUISM، BUDDHISM AND JAINISM — اسی مایوسی کی تعلیم دیتے ہیں۔ اُن کا زاویۂ نگاہ PESSIMISTIC ہے۔ اِس جگہ میں تفصیل سے کام نہیں لے سکتا۔ کیونکہ موضوع سے دُور چلا جاؤں گا۔ اِس زاویۂ نگاہ کے برعکس ہندوستان، ایران اور یونان میں دوسرا فلسفہ یہ تھا کہ -EAT, DRINK AND BE MERRY. اسے EPICUREANISM اور HEDONISM کہتے ہیں یعنی مقصدِ حیات، لذّاتِ دُنیوی کا حصول ہے۔ ÷

اسلام یا قرآن نے اِن دونوں نظریوں کو ردّ کر دیا اور یہ تعلیم دی کہ نہ تو یہ دُنیا EVIL یا شرّ یا بُری ہے، نہ انسان سراسر EVIL یا شرّ ہے ——— بلکہ یہاں دونوں قوّتیں کارفرما ہیں۔ انسان بنیادی طور پہ احسنِ تقویم پہ پیدا کیا گیا ہے، اُسے خیر و شرّ دونوں کا الہام عطا کر دیا گیا ہے :

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ط (سورۃ ۹۱ آیت ۸)

اور اسے آزادی دی گئی ہے کہ وہ جو راستہ چاہے اختیار کرے ——— !!

غرضیکہ اسلام کے فلسفۂ اخلاق کی راہ افراط اور تفریط دونوں سے پاک ہے اور خوف و رجاء کے درمیان ہے : اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ط (۳۹-۹) ÷

+ آیا آں ناسپاس مشرک بہتر است یا کسیکہ او عبادت کنندہ است در ساعت ہائے از شب سجدہ کناں و ایستادہ شدہ - می ترسد از آخرت و اُمید می دارد پروردگارِ خود را + - یعنی قرآن نے انسان کے دل میں بیم و رجا دونوں کیفیتیں یکجا کر دی ہیں۔ اس کی عظمت اور جلال سے ترساں بھی رہو اور اس کی رحمت اور رافت پر بھروسہ بھی رکھو۔ خوف کی وجہ سے انسان غافل اور بے باک نہیں ہو سکے گا اور رحمت کی بدولت وہ مایوسی اور حرمان کا شکار ہونے سے محفوظ رہے گا ❊

قرآن نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ انسان اپنی اخلاقی طاقتوں کا ایسے طریق پر اظہار کرے، جس سے ان کی خوبی اور دلکشی بھی بڑھ جائے اور لوگ اس کے گرویدہ بھی ہو جائیں — ہر خلقِ حسن اگرچہ اپنی جگہ محمود ہے مگر انسان کے طرزِ عمل سے بھی اس کی خوبی میں کمی آجاتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات وہ نیکی بے سود ہو جاتی ہے۔ مثلاً جو شخص صدقات و خیرات کے کام کرتا ہے، وہ بلا شبہ بڑی نیکی کرتا ہے لیکن اگر وہ کام دکھاوے یا حصولِ شہرت کی نیت سے کرتا ہے تو سب کیا دھرا اکارت چلا جاتا ہے۔ اسی لئے اللہ تبارک و تعالیٰ نے متنبہ کیا :

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (تباہ مکنید خیراتِ خود را بمنّت نہادن و آزردہ کردن !) ❊

اسلام نے یہ بھی بتایا ہے کہ اخلاقِ حسنہ اور اخلاقِ سیئہ ایک تسلسل رکھتے ہیں اور بعض اوقات ایک معمولی نیکی، بڑی نیکی اور معمولی سی بدی، بڑی بدی کا سبب بن جاتی ہے۔ نیز ایک نیکی دوسری نیکی کے اکتساب کا اور ایک بدی دوسری بدی کے اکتساب کا سبب بن جاتی ہے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نصیحت فرمائی کہ کسی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو یا بدی کو معمولی بات مت سمجھو۔ اِس لئے چھوٹی سے چھوٹی بدی سے بھی اُسی طرح اجتناب کرو جس طرح بڑی بدی یا برائی سے اجتناب کرتے ہو۔ چھوٹی سی بدی اکثر اوقات بہت بڑی بدی کا ذریعہ بن جاتی ہے ❊

اسلام نے یہ بھی بتایا ہے کہ اخلاقی اقدار اگرچہ فطرت میں مرکوز ہیں۔ لیکن اخلاقی زندگی ساکن اور جامد شئے نہیں ہے، بلکہ بالطبع متحرک ہے اور دنیا میں

اخلاقی ترقّی بتدریج ہوئی ہے۔ افسوس کہ اس کی تشریح کا موقع نہیں ہے کیونکہ موضوع سے انحراف ہوجائے گا۔ بس اتنا اشارہ کافی ہے کہ جیسے جیسے انسانی ذہن نے ترقّی کی ہے ویسے ویسے اخلاقی اقدار اور حقائق منکشف ہوئے ہیں ؛

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے حضرت عیسٰی علیہ السّلام مبعوث ہوئے اور انہوں نے اخلاقی دنیا میں قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ان کا ETHICAL CODE حضرت موسٰی علیہ السّلام کے ضابطۂ اخلاق سے بلند تر ہے۔ لیکن انہوں نے بھی اپنے شاگردوں سے یہ کہا کہ کہنے کی اور بھی باتیں ہیں لیکن ابھی تم انہیں برداشت نہیں کر سکتے۔ (تمھاری روحانی سطح اس قدر بلند نہیں ہوئی ہے!) لہذا اسی تعلیم پر اکتفا کرو۔ ہاں جب میرے بعد "روحِ حق" آئے گی (یعنی رسول معظّم مبعوث ہوگا) تو وہ تمھیں سب کچھ بتا دے گی (یعنی آسمانی تعلیم کو مکمّل کر دے گا) چنانچہ ساتویں صدی عیسوی میں اُس روحِ حق و صدق کا عرب میں ظہور ہوا۔ اور آپؐ نے دنیا کو کامل اور مکمّل ضابطۂ اخلاق عطا فرمادیا جو تمام ادیانِ عالم کی اخلاقی اور رُوحانی صداقتوں کو محیط ہے۔ دُنیا کے مذاہب نے جن جن اخلاقی صداقتوں کو پیش کیا، قرآن اُن سب کا جامع ہے۔ کیونکہ وہ تمام مذاہب کی تمام سچّائیوں کا مصدّق ہے۔ اُس نے تمام کتابوں کی تصدیق کی اور تمام رسولوں کی تصدیق کی اور سب رسولوں کی تعظیم کا حکم دیا، جس کی بدولت مسلمانوں کا اخلاقی زاویۂ نگاہ عالمگیر ہوگیا :-

لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ط ہم (مسلمان) اللہ کے رسولوں میں کوئی فرق نہیں کرتے، سب کی یکساں عزّت کرتے ہیں

یہی وجہ ہے کہ مذاہب و ادیانِ عالم کے جُزوی اختلافات کے باوجود اخلاقی قوانین اور ضوابط کے لحاظ سے تمام ادیانِ عالم میں وحدت کا رنگ پایا جاتا ہے۔ چین، ہندوستان، ایران، عراق، شام اور عرب ہر خطّے کے ہادی اور نذیر نے یکساں اخلاقی تعلیم دی۔ سب نے یہی کہا کہ اللہ ایک ہے۔ نیکی کرو اور بدی مت کرو۔ اللہ سے ملنے کا راستہ تقوٰی، طہارت اور تزکیۂ نفس ہے۔ اللہ تمھارے دلوں کو دیکھتا ہے نہ کہ ظاہر کو۔ وہ مندر میں رہتا ہے نہ مسجد میں بلکہ مومنوں (عاشقوں) کے

دل میں رہتاہے۔ ہندو فلسفے میں بھی اس تعلیم پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ سنسکرت میں قلبِ انسانی کو ھری دہ کہتے ہیں یعنی خدا کا گھر۔ ہم اس لفظ کو اُردو میں ھِردے (دل) کہتے ہیں ؛

ہندو فلسفۂ اخلاق میں خدا کے لئے سب سے اُونچا نام ہری ہے یعنی "دِلرُبا" اِسی لئے حضرت گنج مراد آبادیؒ اللہ کا ترجمہ "من موہن" کیا کرتے تھے — اِس ضمنی بحث کے بعد اب میں قرآنی ضابطۂ اخلاق کی نمایاں تعلیمات پیش کروں گا۔

۱ - قرآن مجید نے خدمتِ خلق پر بہت زور دیا ہے، خصوصًا یتیموں پر مہربانی اور مساکین کو کھانا کھلانا۔ جو لوگ یتیموں سے حُسنِ سلوک نہیں کرتے اور مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے، اللہ کی نگاہ میں : اَرَءَيْتَ الَّذِیْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِیْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ (۱۰۷ - ۱ ، ۲) (کیا آپ نے اُس شخص کے حال پر غور کیا جو جزائے اعمال کی تکذیب کرتا ہے۔ پس یہ وہ شخص ہے جو دھکّے دیتا ہے یتیم کو اور نہیں رغبت دلاتا اوپر کھانا دینے فقیر کے!) کا مصداق ہیں ؛ نیز اللہ فرماتا ہے :

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ يَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ (۹۰ - ۱۲ ، ۱۶) [کس نے مطلع کیا تجھ کو کہ وہ گذرگاہ سخت کیا ہے؟ غلام کا آزاد کرانا، یا بھوک کے دن کھانا کھلانا کسی قرابت دار یتیم کو، یا کسی مفلس گرد آلود کو)

پھر فرمایا کہ نیکی تو یہ ہے کہ :

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ : (۲ - ۱۷۷)

(جو ایمان لایا ساتھ اللہ کے اور دن پچھلے کے اور فرشتوں کے اور کتاب کے اور پیغمبروں کے اور دیا مال اوپر محبّت اس کی کے قرابت والوں کو اور یتیموں کو اور فقیروں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور بیچ چھڑانے گردن کے اور قائم کیا نماز اور دیا زکوٰۃ کو)

پھر فرمایا : وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ (۵۱ - ۱۹)
(اور اُن کے اموال میں سائل اور محروم کا بھی حق ہے!)

ابتدائی زمانے کی سورتوں میں سب سے زیادہ زور عقیدے کے باب میں آخرت پر اور عمل کے باب میں صدقات و خیرات اور مسکین نوازی پر دیا گیا ہے ؛

بنی نوعِ آدم کی خدمت کی اہمیّت اور افادیّت کو آپؐ نے اس مثال سے واضح فرمایا کہ تمام مسلمان بمنزلۂ یک جسم ہیں۔ جب کسی جسم کے کسی ایک حصّے میں درد ہوتا ہے تو سارا جسم درد محسوس کرتا ہے۔ بقولِ سعدیؒ

بنی آدم اعضائے یک دیگراند ؛ کہ در آفرینش ز یک جوہر اند!

چوں عضوے بدرد آورد رُوزگار ؛ دگر عضوہا را نہ ماند قرار

آپؐ نے فرمایا جو شخص یتیموں اور بیواؤں کی خبر گیری کرتا ہے اُسے اُسی قدر ثواب ملے گا، جس قدر ایک مجاہد فی سبیل اللہ کو (بخاری)۔ نیز آپؐ نے فرمایا جو شخص کسی یتیم کی پرورش کرتا ہے وہ قیامت میں میرے ساتھ اس طرح ہوگا جیسے میرے ہاتھ کی یہ دو انگلیاں ؛

(۲) اسی طرح آپؐ نے CHARITY یعنی صدقات کی اہمیّت واضح فرمائی اور آپؐ نے اس تعلیم کو ساری عمر اپنی طرزِ حیات سے واضح فرمایا۔ احادیث میں آیا ہے کہ آپ سب صحابہؓ میں سب سے زیادہ سخاوت اور داد و دہش کرتے تھے۔ آپؐ ہمیشہ اچھی اور عمدہ اشیاء اللہ کی راہ میں دیا کرتے تھے۔ کیونکہ اللہ فرماتا ہے:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝ (۳-۹۱)

نیز حضورؐ نے فرمایا تمھاری دولت میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی غریبوں کا حق ہے۔ آپؐ نے اصلاحِ بنی آدم کا فریضہ تشکیلِ سیرت سے شروع فرمایا۔ پہلے تمام بری باتوں کا ازالہ فرمایا۔ مثلاً شرک، بت پرستی، زنا، شراب، قمار، خیانت اور ظلم و ستم وغیرہ اِس تطہیرِ فکر کے تعمیرِ فکر کا فرض انجام دیا یعنی صحیح عقائد تلقین فرمائے ؛

عقائد کی درستی کے بعد اخلاق کی درستی کا مرحلہ شروع ہوا۔ اور آپؐ نے جس خلق حُسن یا نیکی کی تلقین فرمائی تو اُس پر خود عمل کر کے دکھایا۔ آپؐ نے کوئی اخلاقی تعلیم ایسی نہیں دی جس پر عمل کرنا ناممکن ہو یا دشوار ہو۔ چنانچہ آپؐ کا ارشاد ہے کہ دین میں آسانی ہے تاکہ ہر شخص اُس پر عمل کر سکے۔ آپؐ نے فرمایا جس میں CHARITY نہیں اُس میں انسانیت ہی نہیں ہے۔ آپؐ نے ساری عمر اس سچائی کی

لیغ فرمائی کہ: "صدق امانت ہے اور کذب خیانت ہے!" آپؐ کے دشمن بھی آپؐ کی صداقت اور امانت کے معترف تھے اور آپؐ نے فرمایا کہ سچائی نیکی کی طرف راہنما ہے اور نیکی جنّت کی طرف۔ جھوٹ بدی کی طرف لے جاتا ہے اور بدی انسان کو دوزخ میں لے جاتی ہے!

قرآن مجید نے ایسی سوسائٹی کی بنیاد رکھی جس میں ہر مسلمان ایمان لاکر اعمالِ صالحہ بجالائے اور ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو سچائی اور صبر کی تلقین کرے: وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ؕ ــــــ حضورؐ نے فرمایا کہ افضل جہاد یہ ہے کہ مسلمان ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہے۔ حضورؐ نے ساری عمر راستی، راستگوئی اور راست کرداری اور راستبازی کی تعلیم دی۔ احادیث میں مرقوم ہے کہ حضورؐ کے فیضِ صحبت کی وجہ سے صحابۂ کرامؓ کو جھوٹ سے اس قدر نفرت تھی کہ اس کے مقابلے میں وہ موت کو ترجیح دیتے تھے اور جب تیسری صدی میں اسماء الرّجال کا فن مدوّن ہوا تو تمام مجتہدین کا اس امر پر اجماع ہوگیا کہ کسی صحابی نے کبھی عمدًا جھوٹ نہیں بولا ؛

۳۔ تیسری صفت جس پر آپؐ نے زور دیا وہ استقامت ہے آنحضرت صلعم نے مسلسل تئیس ۲۳ سال تک استقامت کا ثبوت دیا۔ جب غارِ ثور میں صدّیق اکبرؓ نے آپؐ سے شدید الفت کی بنا پر، پریشانی کا اظہار کیا تو آپؐ نے انہیں یہ کہہ کر تسلّی دی کہ: لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (۹-۴۰) قرآن نے اس حقیقت کو واضح فرمادیا ہے کہ استقامت کا ثمرہ یہ ہے کہ ان لوگوں پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے (سچائی پر ثابت قدم رہنا) اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ الخ (۴۱-۳۰)۔ استقامت اور صبر اختیار کرنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے: یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ (۲ — ۱۵۳)

۴۔ شجاعت چوتھی صفت ہے، جس پر قرآن نے بہت زور دیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے: کسی سے مت ڈرو صرف مجھ سے ڈرو! (میری نافرمانی سے بچو): اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (۱۰-۶۲)

۵- شجاعت اور بے خوفی کے ساتھ قرآن نے مسلمانوں کو عاجزی اور انکساری کی تعلیم بھی دی ہے : اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ۝ (۱۶-۲۳) ❊

۶- قرآن نے مسلمانوں کو ایفاءِ عہد کی تلقین فرمائی۔ چنانچہ فرمایا کہ اللہ کے نیک اور مقبولِ بارگاہ بندے وہ ہیں جو وعدہ وفا کرتے ہیں : وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ (۷۰-۳۲) ❊

۷- شرک کے بعد قرآن نے نفاق کی سب سے زیادہ مذمت کی ہے۔ چنانچہ فرمایا "اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝ (۴-۱۴۵) ❊

۸- قرآن نے شکر ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے اور یہ وعدہ کیا ہے کہ اگر تم اللہ کا شکر ادا کرو گے تو وہ تمھیں زیادہ عطا کرے گا : لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (۱۴-۷) ❊

۹- حسنِ معاشرت کے سلسلے میں حضورؐ نے فرمایا کہ تم میں بہترین مسلمان وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں اور جس کی زبان اور ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ قرآن اور حدیث میں والدین کی خدمت اور اُن کی اطاعت کی بڑی تاکید آئی ہے ❊

۱۰- سورۂ بنی اسرائیل کے رکوع ۳، ۴ میں ساری اخلاقی تعلیمات بیان کر دی گئی ہیں اور اُن میں والدین کی اطاعت سرِفہرست ہے : وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ط (۱۷-۲۳) ❊

ایک صحابی نے جہاد میں شرکت کی التجا کی۔ آپؐ نے فرمایا کیا تمھاری ماں زندہ ہے؟ انھوں نے کہا جی ہاں ! آپؐ نے فرمایا "تو ماں کی خدمت کرو کیونکہ جنت ماں کے پاؤں کے نیچے ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کے علاوہ سورۂ حجرات میں بھی تمام ضروری اخلاقی قوانین بیان کر دیئے گئے ہیں ❊

۱۱- قرآن نے غیبت اور بدگوئی کی سخت مذمت فرمائی ہے، کیونکہ اس سے سوسائٹی میں فتنہ و فساد برپا ہوتا ہے، اور اسلام امن و آشتی کا علمبردار ہے۔ اللہ نے فرمایا : يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۖ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ط اَيُحِبُّ

اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ ط (۴۹ — ۱۲)

۱۲- اسلام دُنیا میں پہلا دین ہے جس نے دُنیا کو اُصولِ سہ گانہ یعنی حُرّیت، اخوّت، اور مساوات کامل طور پر عطا کئے اور ساری دُنیا کو کلمۂ توحید پر جمع کیا۔ تمام مومن بھائی بھائی ہیں اور ہر انسان پیدائشی طور پر مسلم اور آزاد ہے۔ کوئی کسی کو اپنا غلام نہیں بنا سکتا۔ ہم سب اللہ کے غلام ہیں۔ اللہ فرماتا ہے: قُلْ یٰٓاَهْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِکَ بِهٖ شَیْئًا الخ (۳-۶۴): "اے اہل کتاب! آؤ ہم ایک ایسی بات پر مجتمع ہو جائیں جو ہمارے تمہارے درمیان مشترک ہے کہ ہم خدائے واحد کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔ اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں گے!"

۱۳- اسلام نے جس طرح انسانوں کے تمام DOWN-TRODDEN پامال طبقوں کی دادرسی کی اسی طرح عورتوں کو بھی اُن کے حقوق عطا کئے جو کسی مذہب نے انہیں عطا نہیں کئے تھے، اور نہ کسی سماجی قانون نے۔ عیسائی مذہب نے تو عورت کو دوزخ کا دروازہ قرار دے دیا تھا۔ نہ وہ آدم کو بہکاتی نہ وہ گناہ کرتے، نہ ساری نسل گنہگار ہوتی نہ خدا کے بیٹے کو کفّارہ ادا کرنا پڑتا۔

اسلام سے پہلے عرب میں عورت کی حیثیت خادمہ سے بھی بدتر تھی جائداد منقولہ و غیر منقولہ میں اسلام نے عورت کو وہ حقوق عطا کئے جو یورپ نے ابھی تک نہیں دیئے۔

۱۴- اسلام نے مزدور کو عزّت کا مقام عطا کیا، اور آپؐ نے فرمایا: اَعْطُوا الْاَجِیْرَ اَجْرَهٗ قَبْلَ اَنْ یَّجِفَّ عَرَقُهٗ اور یہ کہ مزدور کو اُس کی مزدوری اُس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو۔ خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ہر قسم کا کام انجام دے کر ہمارے لئے نمونہ پیش کر دیا۔ آپؐ بعض اوقات اپنی نعلین کی مرمّت بھی کر لیا کرتے تھے۔ خندق کھودنے اور مسجد تعمیر کرنے میں سب مسلمانوں کے ساتھ یہ مشقت برداشت کرتے تھے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے سچے اور امین تاجر سے جنّت کا وعدہ فرمایا ہے، اور تجارت میں ایمانداری کی سخت تاکید فرمائی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ ہم پاکستانی آپؐ کی کسی نصیحت یا حکم پر عمل نہیں کرتے، مگر بخاری اور مسلم آپ ملکی

اخلاقی تعلیمات سے معمور ہیں : HONESTY IS THE BEST POLICY - کی تلقین سب سے پہلے تاجروں کو آپ ہی نے فرمائی ؛

ایک دفعہ آپؐ مدینے کی منڈی میں گئے تو ایک شخص گیہوں کی ڈھیری سے لئے بیٹھا تھا۔ آپؐ نے ڈھیر کے اندر ہاتھ ڈال کر اپنی مٹھی میں گیہوں بھر کر نکالے دیکھا تو گیلے تھے۔ آپؐ نے فرمایا : مَا ھٰذَا یَا صَاحِبَ الطَّعَامِ ؟ اِس کے بعد آپؐ نے منڈی کے تاجروں کو جمع کر کے تجارتی اخلاق پر وعظ فرمایا ؛

۱۵ - دنیا جانتی ہے کہ اسلام ہی پہلا مذہب ہے جس نے شراب کو حرام قرار دیا ورنہ صحت کی خاطر تھوڑی سی شراب پینے کی اجازت عہدِ جدید (انجیل) میں بھی ہے، اور ہندوؤں کے یہاں بھی خاص خاص مذہبی تقاریب میں اِس خانہ خراب کی اجازت ہے۔ اور رگ وید میں تو قدیم آریہ اپنے دیوتاؤں کو بھی شراب پلایا کرتے تھے۔ جسے سوم رس کہتے تھے ؛

خلاصہ کلام اینکہ ! اسلام نے اخلاقی دُنیا میں بھی ایک عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا۔ اور تمام برائیوں کا خاتمہ کر کے عربوں کو جو گناہ اور بدی پر فخر کیا کرتے تھے تقویٰ اور خدا ترسی کا علمبردار بنا دیا۔ قرآن نے فرد اور خاندان اور جماعت اور سوسائٹی اور قوم اور ملک بلکہ ساری دنیا میں ایک شاندار مادّی، عقلی، اخلاقی، علمی اور روحانی بیداری پیدا کر دی۔ جس کی نظیر تاریخ میں نہیں مل سکتی ؛ فَلِلّٰهِ الْحَمْد !

الحمدللہ کہ

کراچی میں

مرکزی انجمن خدام القرآن لاهور کا ذیلی دفتر ۱۴۳، سُنّی پلازا، مولانا حسرت موهانی روڈ، پر قائم هو چکا هے، جو روزانہ ۵ بجے شام سے ۸ بجے شب تک کھلا رهتا هے نیز وهیں پر هر جمعہ کو صُبح ۹ تا ۱۲ درسِ قرآن و حدیث کی نشست هوتی هے ؛ خاکسار : (قاضی) عبدالقادر

معاشی معاملات کا قرآنی تصوّر

از

مولانا محمد طاسین صاحب، مجلس علمی، کراچی

ہم اپنے عقیدے کی بنیاد پر جب یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید رُشد و ہدایت کے لحاظ سے ایک کامل و مکمل کتاب اور ایک نہایت جامع دستورِ حیات ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ قرآن مجید کے اندر حیاتِ انسانی کے ہر ہر جزوی مسئلہ کے لئے تفصیلی ہدایت اور جُزوی حکم مذکور ہے کیونکہ یہ مطلب بداہتہً غلط ہے۔ اس لئے کہ حیاتِ انسانی کے جزوی مسائل بے شمار اور لاتعداد ہیں جن کا کوئی کتاب نہ مکمل طور پر احاطہ کر سکتی ہے اور نہ ان جُزوی احکام پر حاوی ہو سکتی ہے جو اُن بے شمار مسائل کے متعلق ہو سکتے ہیں، اگرچہ کتاب سینکڑوں جلدوں ہی میں کیوں نہ ہو، بلکہ ہمارے اس کہنے کا مطلب یہ ہوتا اور یہ ہو سکتا بھی ہے کہ قرآن مجید اُصول و مبادی کے لحاظ سے مکمل اور جامع کتاب ہے، یعنی یہ کہ اُس کے اندر حیاتِ انسانی کے ہر شعبہ اور ہر پہلو سے متعلق ایسے اُصولی و کُلّی تصوّرات تمام و کمال موجود ہیں جن میں زندگی کے تمام جُزوی مسائل کے لئے اجمالی روشنی پائی جاتی ہے اور جن سے علم و عقل اور فہم و تفقہ رکھنے والے اشخاص زندگی کے ہر ہر جُزوی مسئلہ کے لئے جزوی اور اُصولی ہدایت و راہنمائی اخذ کر سکتے اور یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس جُزوی مسئلہ اور معاملہ کے بارے میں قرآن مجید کا نقطۂ نظر اور عندیہ کیا ہے ؎

اگر کسی کا یہ خیال ہے کہ قرآن مجید میں بعض مسائل کے متعلق اُصولی اور اجمالی ہدایت بھی موجود نہیں تو پھر کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ قرآنِ حکیم کو کس لحاظ اور کس اعتبار سے ایک مکمل اور جامع کتاب کہتا ہے اور اُس کے ذہن میں اس کا کیا مفہوم مطلب ہوتا ہے ؟ ؎

بہر حال میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو قرآنِ حکیم کو اُصولوں کے لحاظ سے ایک کامل

اور جامع کتاب مانتے اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ قرآن حکیم کے اندر وہ مبادی عامّہ اور اُصُولِ کلّیہ بتمام وکمال موجود ہیں جن میں زندگی کے تمام جُزوی مسائل کے متعلق بہتر سے بہتر ہدایت و راہنمائی ہے اور جن میں غور و فکر کرنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کسی مسئلہ کے متعلق قرآن کا نقطۂ نظر اور شرعی حکم کیا ہے ؎

چونکہ آجکل معاشی معاملات کا مسئلہ کافی الجھا ہوا ہے، بعض بڑے اہم معاشی معاملات کے متعلق علمائے کرام کے درمیان شدید اختلاف ہے۔ بعض ان کو جائز اور بعض ناجائز کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اُن کے متعلق احادیث و روایات مختلف ہیں۔ بعض اُن کے جواز پر اور بعض عدمِ جواز پر دلالت کرتی ہیں، جیسے معاملۂ مزارعت۔ اسی طرح دَورِ حاضر میں معاشی معاملات کی کچھ ایسی نئی شکلیں بھی پیدا ہوگئی ہیں جن کا قرآن و حدیث میں ذکر نہیں اور علمائے عصر کی آراء اُن کے متعلق مختلف و متضاد ہیں۔ بعض کے خیال میں وہ جائز ہیں اور بعض کے خیال میں ناجائز۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف مخالفینِ اسلام کو اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کا موقعہ مل رہا ہے اور دوسری طرف ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل ایسے مسائل میں بھی جو دَورِ حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں، علماء کے اختلاف کو دیکھ کر اسلام اور علماء سے بدظن اور بیزار ہو رہی ہے۔ گویا اس اختلاف کے نتیجہ میں اسلام اور ملّتِ اسلام دونوں کو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے۔ لہٰذا شدید ضرورت ہے کہ معاشی مسائل سے متعلق اختلافات کو جلد از جلد دور کرنے کی پوری کوشش کی جائے اور اسلام کے معاشی نظام کو ایک متعیّن اور واضح شکل میں سامنے لایا جائے، اور اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے قرآن مجید کی طرف رجوع کیا جائے، جو ہدایت کا اصل سرچشمہ اور حقیقی منبع ہے۔ اور پورے غور و خوض کے ساتھ اُس کے وہ بنیادی اُصول اور اساسی تصوّرات سمجھے اور متعیّن کئے جائیں جو معاشی زندگی سے متعلق ہیں اور جن کے دائرۂ وسعت میں معاشی زندگی کے تمام مسائل و معاملات آجاتے ہیں۔ اور پھر اُن اُصول و تصوّرات کی تفصیل و تشریح کے لئے جتنی روشنی احادیثِ نبویّہ اور آثارِ صحابہؓ سے مل سکتی ہو، اخذ کی جائے اُس کے بعد اُس مواد سے بھی پورا فائدہ اٹھایا جائے جو ائمۂ مجتہدین اور فقہاءِ کرام نے لکھا ہے اور پھر جس مسئلہ کے متعلق احادیث اور اقوالِ صحابہؓ اور آراءِ ائمہ میں اختلاف ہو وہاں اُن احادیث اقوال اور آراء کو ترجیح دی جائے، جو قرآنی اُصولوں سے زیادہ

مطابق ہوں اور ان کو تاویل کر کے چھوڑ دیا جائے، جو مطابق نہ ہوں میں سمجھتا ہوں یہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے وہ اختلافات ختم ہو سکتے ہیں جو بعض معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز کے متعلق علماء کے درمیان پائے جاتے ہیں جیسے مزارعت وغیرہ، اور ہم اسلام کے معاشی نظام کو ایک ہی متعین شکل میں پیش کر سکتے ہیں ؛

سامعین کرام! اِس وقت اِس مقالے میں میرا مقصد، قرآن مجید کے اس اصولی اور کلّی تصوّر کو پیش کرنا ہے، جو اس نے معاشی معاملات کے جائز و ناجائز اور درست و نادرست کے متعلق تجویز کیا اور جو میں اپنے ناقص علم و فہم کے مطابق قرآنِ حکیم سے سمجھ سکا ہوں لیکن اصل مقصد سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ قرآن مجید میں حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں سے متعلق جو اصول کلیّہ اور مبادی عامّہ ہیں وہ اس شکل و صورت میں نہیں جس شکل و صورت میں وہ وضعی علوم کی انسانی تصنیفات میں ہوتے ہیں یعنی اصول و کلیات مجرّد اور مستقل شکل میں الگ ہوتے ہیں اور وہ جزدی مثالیں الگ ہوتی ہیں جو اُن اصول کلیہ اور مبادی عامہ کو واضح اور ذہن نشین کرنے کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔ بلکہ قرآن مجید میں وہ اصول و مبادی الگ نہیں بلکہ جزئیات کے ضمن میں بیان کئے گئے ہیں، اس لئے کہ یہ طریقہ زیادہ عام فہم بھی ہے اور فصیح و بلیغ بھی۔ اس میں غلطی کا امکان کم اور انسانی فطرت کے زیادہ قریب ہے۔ قرآن مجید جب ایک ہی طرح کی بہت سی جزئیات کے متعلق کوئی اصل کلی اور قانونِ عام بیان کرتا ہے تو اُس کا اسلوب یہ ہوتا ہے کہ وہ اُن جزئیات میں سے کسی ایسی جزئی کو لیتا ہے جو عام طور پر جانی پہچانی اور مشہور و معروف ہوتی ہے اور اُس کے متعلق حکم دیتا ہے کہ وہ جائز ہے یا ناجائز، مشروع ہے یا ممنوع، اور اُس میں اُس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ حکم اُس جزئی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ ہر اس جزئی کے لئے عام ہے جو اپنی حقیقت و ماہیت میں اُس معروف، اور جانی پہچانی جُزئی کے مماثل و مشابہ ہو۔ اس طریقہ کو منطق میں تمثیل اور اصول الفقہ میں قیاس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مجرد کلی کے تصوّر سے جُزئی کا تصوّر آسان ہوتا ہے، کیونکہ کلی کا وجود صرف ذہن میں اور جزئی کا وجود خارج میں ہوتا ہے۔ اسی طرح کلی کے علم سے جُزئی کا علم اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوتا جتنی آسانی سے جزئی کے علم سے جُزئی کا علم حاصل ہوتا ہے لہٰذا تمثیل کا طریقہ زیادہ عام فہم اور غلطی سے نسبتاً زیادہ محفوظ ہے ؛

قرآن مجید میں معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز سے متعلق جو اُصولی اور کُلّی تصوّر ہے وہ بھی اِسی طریقے سے بیان کیا گیا ہے یعنی دو معروف اور جانے پہچانے معاملوں سے متعلق دو حکموں کی بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (اور اللہ نے معاملہ بیع کو حلال و جائز اور معاملۂ رِبا کو حرام و ناجائز ٹھہرایا ہے!) ـــــ قرآن حکیم کی اس آیت میں بظاہر دو خاص جُزوی معاشی معاملات کے متعلق دو حکم بیان کئے گئے ہیں یعنی یہ کہ معاملہ بیع حلال و جائز اور معاملۂ رِبا حرام و ناجائز ہے لیکن درحقیقت اس آیت میں تمام معاشی معاملات کے جواز اور عدم جواز کے متعلق ایسا اُصولی اور کُلّی ضابطہ بیان فرمایا گیا ہے جس کی روشنی میں ہر معاشی معاملہ کے متعلق یہ سمجھا اور فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ قطعی طور پر حلال ہے یا حرام یا مکروہ و مشتبہ معاملہ ہے ـــ گویا اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جو معاشی معاملات اپنی حقیقت و ماہیّت اور اپنی وضع و ساخت میں معاملۂ بیع کی طرح ہیں وہ قطعی طور پر حلال اور جائز ہیں۔ اور جو معاشی معاملات اپنی حقیقت و ماہیّت، اپنی بناوٹ و ساخت اور اپنے اثرات و نتائج میں معاملۂ رِبا کی مثل و مانند ہیں وہ قطعاً حرام اور ناجائز ہیں ؛

معاملۂ بیع کی حقیقت و ماہیّت جسے ہر سمجھدار آدمی بخوبی جانتا پہچانتا یا جسے بادنیٰ تأمّل جان پہچان سکتا ہے، اِس کے سوا کچھ نہیں کہ اُس میں تاجر اپنے سرمائے کے ساتھ خرید و فروخت کی صورت میں محنت و مشقّت کرتا اور نفع کماتا ہے۔ اِس معاملہ میں جہاں عام طور پر تاجر کو نفع ملتا ہے وہاں کبھی کبھی نفع تو درکنار الٹا اصل سرمائے میں بھی نقصان ہو جایا کرتا ہے۔ اسی طرح اس معاملے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں تاجر اپنے اصل سرمائے پر بطورِ نفع جو زائد مال کماتا ہے اُس کے عوض اُس کی طرف سے دماغی جسمانی محنت و مشقّت موجود ہوتی ہے۔ دماغی محنت سے مراد سوچ اور غور و فکر کی وہ ذہنی کاوش ہے جو ایک تاجر مال خریدنے اور بیچنے سے پہلے برداشت کرتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہر تاجر خرید و فروخت سے پہلے یہ سوچتا اور غور و فکر کرتا ہے کہ اُسے کیا مال کہاں سے اور کب خریدنا اور پھر کب اور کہاں کس نفع سے بیچنا چاہیئے۔ یہ اُس کی دماغی محنت ہوتی ہے، اور جسمانی محنت سے مراد جدّوجُہد، دوڑ دھوپ اور نقل و حمل کی وہ زحمت اور تکلیف ہے جو تاجر کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے آنے، مال خریدنے اور اِدھر سے اُدھر منتقل کرنے میں اٹھانی پڑتی

ہے۔ لہٰذا ہر وہ معاشی معاملہ، معاملۂ بیع کے مماثل قرار پاتا ہے جس میں نفع کے بدلے نفع لینے والے کی طرف سے دماغی جسمانی مفید محنت و مشقت موجود ہوتی اور جس میں بعض اوقات نقصان و خسارے کا بھی احتمال ہوتا ہے ؛

اور معاملۂ رِبا کی حقیقت و ماہیت جو عام طور پر متعارف اور جانی پہچانی ہے یہ کہ وہ ایک ایسا معاملہ ہے جس میں ایک فریق اپنا مال دوسرے کو استعمال کیلئے بطور قرض دیتا اور یہ شرط لگاتا ہے کہ مقررہ میعاد کے بعد اس کا اصل مال مع زیادتی اور اضافے کے واپس کرنا ہوگا، لہٰذا اس معاملے میں ایک تو مال والے کیلئے کسی صورت نقصان کا احتمال ہی نہیں ہوتا اور دوسرے اصل مال پر وہ جو زائد لیتا ہے اس کے عوض اس کی طرف سے کوئی جُہد و محنت موجود نہیں ہوتی۔ بنا بریں ہر وہ معاشی معاملہ، معاملۂ رِبا کے مشابہ اور مماثل ٹھہرتا ہے۔ جس میں تحفظ کی ضمانت کے ساتھ ایک فریق اپنا مال دوسرے کو کاروبار میں استعمال کرنے کے لئے دیتا اور بغیر کسی نفع آور محنت و مشقت کے محض اِس بناء پر نفع کے ایک حصّہ کا مستحق قرار پاتا ہے کہ دوسرے نے اس کا سرمایہ استعمال کیا اور اس سے فائدہ اٹھایا ہے ؛

بیع اور رِبا کی اس حقیقت کے پیشِ نظر مذکورہ قرآنی آیت : وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا سے جو اُصولی اور کُلّی ضابطہ نکلتا اور مُستنبط ہوتا ہے وہ یہ کہ ہر وہ معاشی معاملہ حلال اور جائز ہے، جس میں نفع کے ساتھ نقصان کا بھی احتمال ہوتا اور نفع کے عوض، نفع لینے والے کی طرف سے مفید محنت و مشقت بھی موجود ہوتی ہے۔ اور ہر وہ معاشی معاملہ حرام و ناجائز ہے جس میں نفع لینے والے کی طرف سے نفع کے عوض کوئی مفید محنت و مشقت بھی موجود نہیں ہوتی اور اس کے اصل مال میں نقصان کا بھی کوئی احتمال نہیں ہوتا یعنی نقصان کی صورت میں وہ نقصان برداشت کرنے کا ذمّہ دار نہیں ہوتا۔

اس اصول اور کلّی ضابطے کی رُو سے جو معاشی معاملات حرام و ناجائز قرار پاتے ہیں، ان میں مزارعت کا معاملہ سرِفہرست ہے۔ اور یہ محض ہمارے قیاس کی بناء پر نہیں بلکہ خود صاحبِ وحی حضرت محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قیاس کی بناء پر ہے۔ مطلب یہ کہ خود رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مخابرت و مزارعت کو رِبا قرار دیا اور اُس سے اُسی سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، جس سختی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں رِبا سے منع فرمایا

ہے۔ سُنن ابی داؤد میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ایک مرفوع حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ: "وہ کھیت کو سینچ اور پانی دے رہے تھے کہ اُدھر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا۔ آپؐ نے لہلہاتی کھیتی کو دیکھ کر پوچھا کہ یہ کس کی کھیتی ہے۔ مَیں نے عرض کیا حضور! زمین تو فلاں لوگوں کی ہے اور کھیتی میری کاشت کا نتیجہ ہے۔ اِس پر حضورؐ نے فرمایا: "اَرْبَیْتُمَا! تم دونوں رِبا میں مبتلا ہو اِسے ختم کرو اور ختم کرنے کی صورت یہ ہے کہ زمین، زمین والوں کو دے دو اور تم اُن سے اپنا خرچہ لے لو۔!" اِس حدیث میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت کو رِبا یا مماثل رِبا فرمایا۔ اور دوسری حدیث جس کے راوی حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ہیں اور جو زیادہ مکمل صورت میں مستدرک حاکم میں ہے اُس کا ترجمہ یہ ہے کہ: "حضرت جابرؓ نے کہا کہ جب قرآن مجید میں تحریمِ رِبا کی آیات نازل ہوئیں تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مزارعت نہ چھوڑے اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ جنگ کر رہا ہے"۔ یہ بعینہٖ وہی الفاظ ہیں جو قرآن مجید میں رِبا نہ چھوڑنے والوں کے لئے خود اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں ؎

مزارعت کی رِبا کے ساتھ جو مماثلت ہے وہ یہ کہ جس طرح رِبا میں سرمائے والے کے لئے اس کا سرمایہ محفوظ رہتا ہے اسی طرح مزارعت میں زمین والے کے لئے اس کی زمین محفوظ رہتی ہے۔ کاشت کرنے سے نہ صرف یہ کہ اس کی قیمت گھٹتی نہیں بلکہ بنجر و بیکار زمین کی قیمت آباد کرنے سے بڑھ جاتی ہے۔ اور جس طرح رِبا میں سُود خور بغیر کسی محنت و مشقت کے اپنے اصل مال پر مزید مال کا مستحق بنتا ہے، اسی طرح مزارعت میں بھی زمیندار بغیر کسی محنت و مشقت کے پیداوار کے ایک حصّہ کا مستحق قرار پاتا ہے، اسی طرح نکمّے پن اور مفت خوری سے جو معاشرتی بیماریاں سُود خور کے اندر جنم لیتی ہیں وہی بیماریاں تقریباً زمیندار کے اندر بھی رُونما ہوتی ہیں اور دیکھا جائے تو آج کا کارخانہ دار اور سرمایہ کار بھی معاشرتی بدعنوانیوں میں کسی طرح پیچھے نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی ہے اِلّا ما شاء اللہ ط ——— !!

معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز سے متعلق قرآن مجید کا جو اُصولی اور کُلّی ضابطہ عرض کیا گیا ہے اُس کی روشنی میں موجودہ صنعتی دَور کے معاشی معاملات کا جائزہ لیا جائے

تو صنعت، تجارت اور سرمایہ کاری سے متعلق بہت سے معاملات حرام و ناجائز کی فہرست میں آتے ہیں۔ جن کی تفصیل اِس مختصر مقالے میں پیش نہیں کی جا سکتی ؎

اس سلسلے میں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ معاشی معاملات میں بعض معاشی معاملات ایسے بھی ہیں جو نہ کامل طور پر معاملۂ بیع کے مماثل اور نہ پوری طرح سو فیصد معاملۂ رِبا کے مماثل و مشابہ ہیں۔ بلکہ ایک پہلو سے معاملۂ بیع کی طرح اور دوسرے پہلو سے معاملۂ رِبا کی مانند ہیں۔ جیسے معاملۂ مضاربت اور معاملۂ اجارہ کہ یہ دونوں ایک پہلو سے معاملۂ بیع سے اور دوسرے پہلو سے معاملۂ رِبا سے ملتے جلتے ہیں۔ معاملۂ مضاربت اِس پہلو سے معاملۂ بیع سے ملتا جلتا ہے کہ اُس میں مضارب کو جو نفع ملتا ہے اُس کے عوض اُس کی طرف سے محنت و مشقّت موجود ہوتی ہے۔ نیز اُس میں اگر نقصان ہو جاتا ہے تو اسے سرمائے والا فریق برداشت کرتا ہے، اور اِس پہلو سے معاملۂ رِبا سے مماثلت رکھتا ہے کہ اس میں عموماً سرمائے والا فریق جو نفع لیتا ہے اُس کے بدلے اُس کی طرف سے کوئی محنت و جُہد موجود نہیں ہوتی، نیز دونوں معاملوں میں ایک فریق مجبور بھی ہوتا ہے ؎

اسی طرح معاملۂ اجارہ اس پہلو سے معاملۂ بیع کے مماثل ہے کہ اس میں مؤجر اور مستاجر یعنی کرائے پر چیز دینے اور لینے والے کی حیثیت بائع اور مشتری کی سی ہوتی ہے اور دونوں اپنی اپنی چیز کا معاوضہ پاتے ہیں، استعمال ہونے سے کرائے کی چیز کی قیمت میں جو کمی واقع ہوتی ہے اُس کے عوض موجر کو نقد وغیرہ کی شکل میں معاوضہ مل جاتا ہے اور کرایہ دار جو کرایہ ادا کرتا ہے، اس کے عوض وہ فائدہ ہوتا ہے جو وہ اس شئے سے اٹھاتا ہے اور اس پہلو سے اجارہ رِبا کے مشابہ ہوتا ہے کہ مالک اپنے نقصان سے جو اس کی چیز میں واقع ہوتا ہے کہیں زیادہ کرایہ وصول کرتا ہے اور اس زیادہ کے عوض اس کی طرف سے کوئی محنت و جُہد نہیں ہوتی۔ نیز معاملۂ رِبٰو کی طرح معاملہ اجارہ میں بھی ایک فریق کی مجبوری کارفرما ہوتی ہے۔

بہر حال اس قسم کے معاشی معاملات جو ایک پہلو سے معاملۂ بیع کی طرح اور دوسرے پہلو سے معاملۂ ربٰو کی طرح ہوتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کی مذکورہ آیت کی رُو سے نہ انہیں بیع کی طرح قطعی حلال اور نہ رِبا کی طرح قطعاً حرام کہا جا سکتا ہے بلکہ اُن کی شرعی حیثیت بین بین سی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسے معاشی معاملات کو ایک حدیثِ نبوی میں مشتبہات سے تعبیر فرمایا گیا ہے وہ حدیثِ سُنن ابوداؤد میں ان الفاظ سے بیان فرمائی گئی ہے :-

:"عن نعمان بن بشیر قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول : انّ الحلال بیّن وانّ الحرام بیّن و بینھما امور مشتبہات لا یعلمھا کثیر من النّاس فمن اتقی الشبہات استبرأ دینہ وعرضہ ومن وقع فی الشبہات وقع فی الحرام ط !"

ترجمہ اس حدیث کا یہ ہے :

حضرت نعمان بن بشیر نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے سُنا کہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح اور بیّن - اور ان دونوں کے درمیان مشتبہ اُمور ہیں، جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے - پس جو ان مشتبہ اُمور سے بچا اُس نے اپنے دین اور اپنی آبرو کو محفوظ کر لیا، اور جو ان مشتبہات میں پڑا وہ حرام سے نہ بچ سکا ۔

اِس قسم کے مشتبہ معاشی معاملات فقہ کی زبان میں مکروہ کے تحت آتے ہیں اور جن کو جائز کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حرام نہیں، یہ مطلب نہیں ہوتا کہ واجب و مستحب ہیں - اُصولِ فقہ کی کتابوں میں جائز کے یہ دونوں معنیٰ مذکور ہیں - مثال کے طور پر طلاق کو لیجئے کہ وہ جائز تو ہے لیکن اَبْغَضُ الْمُبَاحَات ہونے کی وجہ سے مکروہ و ناپسندیدہ بھی ہے — غرضیکہ اسلام مشتبہ اور مکروہ قسم کے معاملات سے اگرچہ اس سختی کے ساتھ نہیں روکتا جس سختی کے ساتھ وہ محرّماتِ قطعیہ سے روکتا ہے - لیکن وہ اس قسم کے معاملات کو پسند بھی نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ مسلمان اِن کی بجائے اُن معاملات کو اختیار کریں جو بلاشبہ اور قطعی طور پر حلال ہیں - کیونکہ اس قسم کے معاملات کے ہوتے ہوئے معاشرے میں وہ معاشی اعتدال و توازن پیدا نہیں ہو سکتا جو اسلام چاہتا ہے - اسلام یہ چاہتا ہے کہ معاشرے کے ہر ہر فرد کو کسی نہ کسی شکل میں بنیادی معاشی ضروریات بھی میسّر ہوں اور ہر ایک کے لئے اپنی ضرورت سے زیادہ کما سکنے یعنی معاشی ترقّی کا موقعہ بھی ہو - بالفاظِ دیگر اسلام جس طرح بنیادی معاشی ضروریات میں توازن چاہتا ہے - اسی طرح معاشی ترقّی میں بھی توازن چاہتا ہے، اس لئے کہ اگر کسی معاشرے کے تمام افراد کو بنیادی معاشی ضروریات تو میسّر ہوں لیکن معاشی ترقّی کے مواقع سب کو مساوی طور پر حاصل نہ ہوں، بلکہ بعض افراد پر اس کے راستے کھلے ہوئے اور دوسرے بعض پر بند اور مسدود ہوں تو ایسا معاشرہ معاشی لحاظ سے غیر متوازن

ہوتا ہے اور اس کے اندر ایسے حالات پیدا ہونے کا برابر اندیشہ رہتا ہے جو سب کیلئے بدامنی اور بے چینی کا باعث بنتے ہیں ۔

ادھر اسلام کے سامنے آئیڈیل سوسائٹی اور مثالی معاشرے کا جو تصوّر ہے اُس کے اندر ایسے معاشی معاملات کی کوئی گنجائش نہیں جن کو ایک فریق اپنی مجبوری کے تحت اختیار کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مضاربت پر وہی شخص کام کرتا ہے جس کے پاس حسبِ ضرورت اپنا سرمایہ نہیں ہوتا اور جسے دوسرا کوئی فی سبیل اللہ یا قرضِ حسنہ کے طور بھی نہیں دیتا لہٰذا وہ بادلِ نخواستہ اور بامرِ مجبوری مضاربت پر کام کرنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔ مطلب یہ کہ جس کے پاس اپنا سرمایہ ہو وہ مضاربت پر اس لئے کام نہیں کرتا کہ اپنے سرمائے کے ساتھ تجارت کرنے کی صورت میں اُسے پورا منافع ملتا ہے جب کہ مضاربت پر کام کرنے کی صورت میں اُس کا ایک حصّہ ملتا ہے اور کون ہے جو خوشی کے ساتھ پورے کے مقابلہ میں ادھورے کو اختیار کرتا ہے۔ چونکہ اسلام کے مثالی معاشرے میں پہلے تو ہر کام کرنے والے کے پاس اپنا سرمایہ ہوتا ہے۔ اور اگر کسی کے پاس حسبِ ضرورت اپنا سرمایہ نہیں ہوتا تو اُسے دوسرے افراد فی سبیل اللہ یا قرضِ حسنہ کے طور پر دیتے ہیں لہٰذا کسی کو مضاربت پر کام کرنے کی ضرورت نہیں رہتی اور یہ معاملہ خود بخود ختم ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اس مثالی معاشرے میں پہلے تو ہر فرد کے پاس اپنی ضرورت کا سامان ہوتا ہے۔ اور اگر کسی کے پاس کوئی چیز نہیں ہوتی تو دوسرے افراد اس کو صدقہ، ہبہ اور عاریت کے طور پر دے دیتے ہیں۔ لہٰذا اجارے اور کرائے کا معاملہ خود بخود ختم ہوجاتا ہے۔

بہرحال جب تک معاشرے کی اکثریت کے ذہن میں انفاق فی سبیل اللہ اور قرضِ حسنہ کا جذبہ نہیں ابھر جاتا جو ایمانی عقائد سے پیدا ہوتا اور اسلامی عبادات کے ذریعے قائم اور زندہ رہتا ہے، اور جب تک معاشرے کی عظیم اکثریت بنیادی معاشی ضروریات میں خود کفیل نہیں ہوجاتی اُس وقت تک مضاربت اور اجارے جیسے معاشی معاملات کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہمیشہ قائم رکھنے کے ارادہ سے نہیں بلکہ بالآخر ختم کردینے کے ارادہ سے اور بادلِ نخواستہ، مطلب یہ کہ اگر آج ہم موجودہ معاشی نظام کے بعض پہلوؤں کو سُود کی بجائے مضاربت پر تشکیل دیں تو نسبتہً بہتر ہوگا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری طرف سے یہ اعلان کرنا ضروری ہوگا کہ یہ جو ہم پیش کر رہے ہیں۔ یہ اسلام کے

معاشی نظام کی حقیقی اور آخری تعبیر و ترجمانی نہیں بلکہ اس صورت کو ہم اپنے موجودہ حالات کے تحت عبوری اور وقتی لائحہ عمل کے طور پر اختیار کر رہے ہیں۔ یہ ہماری آخری منزل نہیں بلکہ عبوری مرحلہ ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ کہ ایک طرف قوم اس عبوری مرحلہ کو آخری منزل سمجھ کر اس پر ہی اور رُکی نہیں رہے گی، بلکہ اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے گی اور دوسرا فائدہ یہ کہ اس عبوری لائحہ عمل کی بناء پر کسی کو اسلام کے خلاف ایسے پروپیگنڈے کا موقعہ نہیں ملے گا کہ اگر اسلام کا حقیقی معاشی نظام یہی ہے تو اس میں کیا رکھا ہے، یہ تو وہی نظامِ سرمایہ داری کا مثنّٰی ہے ۔

سامعینِ کرام! معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز سے متعلق میں قرآن مجید کا جو اصولی تصوّر اور کُلّی ضابطہ پیش کیا ہے، یہ معاشی عدل اور معاشی ظلم کے اُس خاص تصوّر پر مبنی ہے جو خود قرآن مجید نے تجویز کیا ہے، اور معاشی عدل اور معاشی ظلم کا جو مفہوم و مطلب قرآن مجید میں ہے وہ معاشی حق کے ایک مخصوص تصوّر پر مبنی ہے۔ لہٰذا جب تک یہ واضح نہ ہو کہ قرآن مجید کسی شخص کو کس بناء پر کسی معاشی شئے کا حقدار ٹھہراتا ہے، معاشی عدل اور معاشی ظلم کا مفہوم و مطلب واضح نہیں ہوتا جو قرآنِ حکیم میں ہے، سو عرض ہے کہ قرآن مجید صرف دو چیزوں کی بناء پر کسی انسان کو کسی شئے کا حقدار ٹھہراتا ہے: ایک جُہد و محنت کی بناء پر، اور دوسرے لین دین کے ایسے طریقے کی بناء پر جس میں دینے والے کے لئے اس کی شئے کا مادّی یا معنوی، دُنیوی یا اُخروی کوئی معاوضہ موجود ہونا لہٰذا اُس کی حقیقی رضامندی پائی جاتی ہے۔ اِن دو چیزوں کے بعد وہ تیسری کسی چیز کی بنیاد پر کسی شخص کو کسی چیز کا حقدار نہیں ٹھہراتا مثلاً کسی کو اس بناء پر کسی مال کا حقدار نہیں تسلیم کرتا کہ دوسرے نے اس کا سرمایہ استعمال کیا اور اس سے فائدہ اٹھایا ہے، جب کہ سرمائے والے کے لئے اُس کے سرمائے کے تحفظ کی پوری ضمانت موجود تھی۔ اور یہ اس لئے تسلیم نہیں کرتا کہ اس کے نزدیک سرمایہ کسی مال و دولت کو پیدا نہیں کرتا ۔

لہٰذا مذکورہ دو چیزوں کی بناء پر کسی شخص کو کسی شئے کا حقدار ماننا عدل ہے اور ان دو چیزوں کے سوا تیسری کسی چیز کی بناء پر حقدار ٹھہرانا خلافِ عدل اور ظلم ہے اور چونکہ بیع کی قسم کے معاملات میں حق کی ایک بنیاد جُہد و محنت موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ مطابق عدل، اور ربٰا کی قسم کے معاملات میں حق کی دو بنیادوں میں سے ایک بھی موجود نہیں

ہوتی لہٰذا وہ مطابق ظلم قرار پاتے ہیں۔ اسلام چونکہ عدل قائم کرنا اور ظلم مٹانا چاہتا ہے لہٰذا اس نے بیع کی قسم کے معاملات کو جائز اور ربا کی قسم کے معاملات کو ناجائز قرار دیا ہے۔

قرآن حکیم کی جن آیات میں ربا کی تحریم اور ممانعت کا بیان ہے ان میں ایک آیت یہ ہے:

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝

(اور اگر تم ربا سے توبہ کرلو تو پھر تمہارے لئے صرف تمہارے اصل مال ہیں نہ ظلم کرو اور نہ ظلم کئے جاؤ ——!!)

اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو شخص کسی کو سود پہ مال دیتا ہے وہ اپنے اصل مال سے زیادہ کسی چیز کا حقدار نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ جو کچھ بھی زائد لیتا ہے دوسرے کا حق لیتا ہے اور ظلم کرتا ہے۔ اسی طرح اگر دوسرا اُس کی پوری رقم واپس نہیں کرتا تو وہ بھی ظلم اور حق تلفی کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی طرح اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سرمایہ نہ کسی مال و دولت کو پیدا کرتا اور نہ اُس کے استعمال پہ اس کا مالک کسی معاوضے کا حقدار بنتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اصل مال کے ساتھ کچھ بھی زائد لینے کو ظلم سے تعبیر نہ کیا جاتا، کیونکہ ظلم کے معنی ہیں دوسرے کا حق مارنا اور تلف کرنا ۔

مفسرین حضرات نے تحریم ربا کی وجوہ میں ایک وجہ یہ لکھی ہے کہ مُقرض قرضہ دینے والا اپنے اصل مال کے ساتھ جو زائد لیتا ہے، چونکہ اُس کا کوئی عوض اور بدل موجود نہیں ہوتا لہٰذا وہ حرام ہے۔ تفسیر احکام القرآن میں علامہ جصاص کی عبارت یہ ہے:-

"ان تلك الزيادة المشروطة انما كانت ربا فى المال العين لانه لا عوض لها من جهة المقرض (اصل مال میں یہ مشروط زیادتی اِس لئے رِبائے حرام ہے کہ قرض خواہ کی طرف سے اُس کا کوئی موجود نہیں ہوتا!) — علامہ رشید رضا تفسیر المنار میں لکھتے ہیں: وهناك وجه اخر وهو ان الله تعالى جعل طريق تعامل الناس فى معايشهم ان يكون استفادة كل واحد من الاخر بعمل، ولم يجعل لاحد منهم حقا على اخر بغير عمل لانه باطل لا مقابل له، وبهذه السنة اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ لان فيه عوضا يقابل عوضا وَحَرَّمَ الرِّبَا لانه لا مقابل لها (ص ۱۰۸- ج ۳) [اور یہاں ربا کے حرام ہونے کی ایک وجہ اور ہے، اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے درمیان معاشی معاملات کا طریقہ یہ مقرر

فرمایا ہے کہ ہر ایک دوسرے سے جو فائدہ اٹھائے وہ کام اور عمل کے بدلے اٹھائے اور اس نے کام و عمل کے بغیر کسی کے لئے کسی پر کوئی حق نہیں ٹھہرایا کیونکہ وہ باطل ہے اس لئے کہ اس کا کوئی بدل و مقابل نہیں، اور اللہ نے اسی سنّت اور طریقہ کے تحت بیع کو حلال ٹھہرایا، کیونکہ اس میں عوض کے مقابل عوض ہوتا ہے اور ربا کو حرام ٹھہرایا اس لئے کہ اس کا کوئی بدل اور عوض نہیں ہوتا ؛

علامہ سید قطب نے اپنی تفسیر فی ظلال القرآن میں لکھا ہے: "ولا ان یلد المال المال۔ انما یلد المال الجھد والا فھو حرام !" (اور نہ مال کو مال جنم دیتا ہے بلکہ مال تو صرف جہد و محنت سے پیدا ہوتا ہے، ورنہ اس کا لینا حرام ہے !) — پھر کچھ آگے ربا کی بحث میں ہی لکھتے ہیں: فالمال لایو بح الا بالجھد و الجھد ھوالمعول علیہ فی الاسلام لذلک یحرم الربا فی جمیع الاحوال ط (پس مال نہیں بڑھتا مگر جہد و محنت، اور جہد و محنت ہی پر اسلام میں اعتماد اور دارومدار ہے۔ اسی وجہ سے وہ ربا کو تمام حالات میں حرام ٹھہراتا ہے !)

بقیہ ص ۴۸ !

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی ؛ سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی

یہ چند معروضات پیش کرنے کے بعد یہ عاجز دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی اخلاقی اور روحانی تربیت قرآنِ حکیم کے مطابق حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور قرآنِ پاک کے ارشاد کے مطابق ہمیں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوۂ حسنہ صحیح احادیث سے معلوم کرکے اس کے مطابق اپنی پوری زندگی کو ڈھالنے کی سعادت مرحمت فرمائے اور علمائے حق و بزرگانِ دین کی صحبت سے مستفیض ہونے کے اسباب میسّر فرمائے آمین ثم آمین ——— آخر میں یہ عاجز انجمن خدام القرآن اور منتظمینِ قرآن کانفرنس کا شکریہ ادا کرتا [illegible]

اور اس سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو دونوں جہان میں جزائے خیر عطا فرمائے اور اُن کے اِس نیک کام میں برکت و ترقی اور استقامت نصیب فرمائے۔
اب میں اس مضمون کو علامہ اقبال مرحوم کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن ؛ نیست ممکن جز بقرآں زیستن

عصرِ حاضر کے چیلنج کا نعرہ

اس کی حقیقت اور اس کا جواب

از: ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی (علیگ)

عصرِ حاضر کے چیلنج کا نعرہ یہ ہے کہ قرآن سے وہ رہنمائی میسّر نہیں آئی جو اس زندگی میں ترقی کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے جب تک مسلمان جدید تہذیب کی پیروی نہ کریں، اُن کا مستقبل تاریک رہے گا۔ یہ تو چیلنج کا صرف نعرہ ہے، اور اس نعرے کی اصل حقیقت یہ ہے کہ جب سے پی اے سوروکن آسوبلڈ اسپنگلر ٹوائن بی اور برٹرینڈ رسل نے یہ کہا ہے کہ مغربی تہذیب تباہی کو پہنچ چکی ہے، اور اب اس کا بچنا ناممکن ہے۔ جدید مغربی تہذیب کے ادنیٰ درجہ کے محافظوں کا خیال یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کا اعتماد اپنی تہذیب کی برتری کے باب میں متزلزل رہے تو یہ دم توڑتی ہوئی تہذیب کچھ دن اور باقی رہ سکتی ہے۔ اس لئے وہ مسلمانوں کو یہ باور کرائے رکھنا چاہتے ہیں کہ ان کا مستقبل اسلام سے نہیں، مغربی تہذیب کی پیروی سے وابستہ ہے۔ اس کارِ دِعمل شکست خوردہ مسلم ذہن پر یہ ہے کہ وہ فکرِ جدید کے تقاضوں سے اسلام کو معذرت کوشی کے انداز میں سازگار بنا کر اسلام سے اپنی وابستگی کا جواز پیدا کرتے ہیں۔ اور اپنی زندگی کے تقاضے جدید مغربی تہذیب کی پیروی سے پورے کرنا چاہتے ہیں اور بباطن وہ اس چیلنج کو حقیقت سمجھ کر اس کا جواب دینے سے عاجز ہیں۔ اس عجز کی وجہ اسلام کی نتیجہ خیزی کے بارے میں ان کی بے یقینی ہے۔ اور بے یقینی کی بنیاد بین الاقوامی سطح پر پے در پے شکست ہے ؎

دراصل یقین کی حیثیت تیراکی کے فن کی سی ہے، جب کوئی پانی میں کُود کر

ڈوبنے اور تیرنے کی کشمکش میں پڑ کر تیرنے میں کامیابی حاصل کرتا ہے تو تیراک بنتا ہے، اور حق و باطل کی کش مکش میں پڑ کر باطل پر غالب آتا ہے تو اس کا یہ اعتماد بحال ہوتا ہے کہ حق غالب ہی آنے کے لئے ہے۔ مگر جب حق و باطل کی کش مکش غلبۂ حق کی صورت میں اتمام کو نہ پہنچے تو نہ تو باطل کے وجود کا انکار ہو سکتا ہے نہ اس کے مؤثر ہونے کا۔ تاریخ اسلام میں جب پیغمبرانہ قیادت کی اخلاقی تعلیم کا اثر زائل ہونے لگا تو زوالِ سیرت کا علاج قانون سازی کے ذریعہ کیا گیا اور ولولہ فتوحات کی بنیاد پر پیدا ہوتا رہا۔ تو یقین نتیجہ خیزی کے مشاہدے سے تازہ ہوتا رہا۔ مگر جب ایک تاریخی حادثے کے طور پر یہ تقسیم کار وضع ہوئی کہ اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت سلاطین کے ذمہ، قانون سازی علماء کے ذمہ اور سلاطین کی نوازشات کی بدولت علماء نے شریعت کے بجائے تشرّع کا نقطۂ نظر اختیار کیا تو اصحابِ طریقت نے اتباعِ شریعت میں خلوص پیدا کرنے کی جدّ و جہد کی تو صوفیاء کے ذریعہ تزکیہ اور روحانی اصلاح ہوتی رہی۔ مگر جب سلاطین اقتدار سے محروم ہوئے اور اسلامی قانون قوّتِ نافذہ سے محروم ہوا تو علماء اور صوفیاء دونوں بے بس ہو گئے۔ جب یہ مشاہدہ کیا گیا کہ عبادات اور عقائد کی حفاظت کے لئے جان کی بازی لگانے والے غلامی کے لئے مختص کر دیئے گئے اور تقویٰ شکن مستعمراتی نظام کو اقتدار دے دیا گیا تو نومذہبی ذہن نے اپنی ناکامی کی صحیح توجیہ نہ کر سکنے کی بنا پر اپنی ناکامی کا سبب اللہ کے بے نیازی کو قرار دیا اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ مذہبی ذہن بے جان عقائد، مردہ ذہن، فرقہ پرستانہ آرزوؤں اور مفاد پرستانہ گروہ بندیوں کو پیغمبرانہ راہِ حق پرستی سمجھتا رہا اور اب بھی یہی سمجھتا ہے دشمنوں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہوتا اور ناکامی کی بناء پر بے یقینی میں مبتلا رہتا ہے۔ یہ دور کافرانہ یقین اور مومنانہ بے یقینی کی کش مکش کا دور ہے۔ کیونکہ ایک اشتراکی اپنے طریقِ کار کی نتیجہ خیزی کا یقین رکھتا ہے اور ایک فرقہ پرست مسلمان اپنے طریقِ کار کی نتیجہ خیزی سے مایوس ہو چکا ہے مگر اپنے طرزِ عمل کا جائزہ لینے کے لئے تیار نہیں۔ ہر مذہبی گروہ چند مابعد الطبیعاتی عقائد، چند اخلاقی اسباق، چند معاشرتی اصولوں، چند تمدّنی ضوابط، چند عدالتی قوانین اور چند رسوم و ظواہر کو دین کامل سمجھتا ہے اور یہ جانتے ہوئے کہ دینِ کامل

کا یہ تصوّر زندگی پر اثر انداز نہ رہنے کی بنا پر دلوں کو نہیں گرماتا۔ اس کا ردِ عمل سیکولر ذہن پر یہ ہے کہ نظامِ حیات سیکولرازم ہی رہے تو فرقہ پرستیاں نجی انفرادی زندگی کا مسئلہ بنی رہیں گی۔ اور مسائلِ زندگی سیکولرازم سے حل ہوتے رہیں گے، اس لئے سیکولرازم کو نہ بدلا جائے ؛

مسلمانوں کے اس حال سے اسلام کے دشمن فائدہ اٹھا کر اسلام کے باب میں انہیں بے یقینی میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں — کراچی میں جو آل ایشیا اسلامی کانفرنس ہوئی تھی اس کے خطبۂ استقبالیہ میں محترم جنرل ضیاء الحق صاحب نے وہ تین سوال بیان کئے تھے جو دشمنانِ اسلام طنزاً مسلمانوں پہ کرتے ہیں۔ سوالات یہ تھے :

(۱) اگر واقعی اسلام اتنا عظیم ضابطۂ حیات ہے جو مسلمانوں کو اس دنیا میں اور اگلی دنیا میں سرخروئی مہیا کرتا ہے، تو کیا وجہ ہے کہ مسلمان آج دنیا میں دوسروں کے محتاج اور اُن کے زیرِ اثر ہیں۔ ؛

(۲) اگر اسلام کے بتائے ہوئے اُصول، بہترین اُصول ہیں تو خود مسلمان اُن پہ عمل کیوں نہیں کرتے ؛

(۳) اگر بنی نوعِ انسان کی نجات اسلام اور اسلامی اصولوں پہ قائم کئے ہوئے معاشرے میں ہے تو کیا وجہ ہے کہ مسلمان ممالک ایسا معاشرہ اپنے ہاں قائم نہیں کرتے ؛

اور اُن کا مقصد ان سوالات کو خطبۂ استقبالیہ میں بیان کرنے سے یہ تھا کہ مندوبین کانفرنس اِن سوالات کا جواب دیں گے۔ مگر کسی مندوب کو ان سوالات کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اور ہمارے فرقہ پرستیوں کے نمائندے بھی ان مسائل کی طرف اس لئے متوجّہ نہیں ہو سکے کہ ہماری فکری بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں ؛

فکری بنیادوں کے کھوکھلے پن کو رفع کر کے اسلام کے باب میں اپنے اعتماد کو از سرِ نو بحال کرنے کی شرط یہ ہے کہ :

(۱) پہلے ہم علم بالوحی اور انسانی استعداد کے زائیدہ علم کے درمیان امتیاز

کو مدِ نظر رکھ کر اس التباس پر غالب آئیں جو ہم نے بنیادی امتیازات کو نظر انداز کر کے اپنے اندر خود پیدا کیا ہے ؛

(۲) پھر ہم اپنے اس دینی فکر کا جائزہ لیں جو ہر چند کہ کتاب و سنت سے ماخوذ ہے، مگر قرآنی وحی کا بدل نہیں بن سکتا - اور

(۳) انسانی ذہن کے زائیدہ اس فکر کے بے نتیجہ پن نے ہمیں جن غیر اسلامی افکار و نظریات سے اپنے مسائل حل کرنے کی طرف دھکیلا ہے اُن کا بھی تنقیدی جائزہ لیں ——— اور

(۴) وہ انسانی استعداد کے زائیدہ فکر کی نشوونما کو بصیرت کے بجائے اقدام و خطا (TRIAL AND ERROR) سے ہو رہی ہے - اس کی تکمیل کا رخ علم بالوحی کی روشنی میں متعین کر کے علم بالوحی سے اپنے مسائل بغیر تعبیر کے، بغیر تفسیر کے، بغیر تاویل کے حل کرنے کی جد و جہد سے علم بالوحی کی نتیجہ خیزی کی نسبت اپنا اعتماد جو متزلزل ہو رہا ہے، اُسے بحال کریں، تو اس چیلنج کا جواب دے سکیں گے، جسے ہم نے اپنی بے یقینی کی بنیاد پر چیلنج سمجھ لیا ہے - حالانکہ وہ چیلنج نہیں صرف ایک نعرہ ہے جس سے ہم لرزہ براندام ہیں ؛

قرآن مجید کے ان تمام دعاوی کے باوجود جو قرآن نے اپنے بارے میں کئے ہیں - اور قرآنی وحی کے ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف اور ایک ایک زیر و زبر کے محفوظ ہونے کے باوجود اگر ہم انسانی ذہن ہی کے زائیدہ فکر کے محتاج رہیں - علم بالوحی کی اہمیت کے باب میں ہم بے یقینی ہی کا شکار رہیں، ہم تسلیم کریں یا نہ کریں ؛

اس بے یقینی کی وجہ یہ ہے کہ قانون ساز مذہبی ذہن قرآن مجید کو صرف اصول مہیا کرنے والی کتاب سمجھ کر ہدایت اپنی تعبیر کو سمجھتا ہے - کیونکہ قرآن مجید سے قانون سازی میں رہنمائی طلب کرنے کے علاوہ قرآن سے کوئی اور تمنا اس نے نہیں کر سکا کہ اس نے قرآن مجید کو خود ان دعووں کی روشنی میں سمجھنے کے لئے صحف ماسبق کی تمثیل پر قیاس کر کے اسے صرف قانون کا ماخذ اس

اندازے سے مانا ہے کہ قانون سازی میں قرآن کی کمی حدیث سے، حدیث کی کمی اجماعِ صحابہ اور اجماع کی کمی قیاس سے، قیاس کی کمی اجتہادِ نو سے اور نتیجہ یہ ہے کہ انسانی ذہن کے زائیدہ علم کی حاجتمندی ختم نہیں ہوتی ؛

انسانی استعداد کا زائیدہ علم اس استعداد کی نشوونما کا نتیجہ ہے جس کی استعداد کے ودیعت کئے جانے کا اشارہ : عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا۔ میں موجود ہے۔ جو انسانی تجسّس کا نتیجہ ہے جس کی نشوونما تمام کو اس لئے نہیں پہنچی کہ اس کی نشوونما اقدام وخطا سے ہو رہی ہے۔ اور قرآنی وحی کا علم وہ علم ہے جس کی احتیاج انسانی استعداد کے زائیدہ علم سے پوری نہیں ہو سکتی۔

علم بالوحی کا موضوع نصب العین ہے اور انسانی علم کا موضوع حقیقت ہے۔ علم بالوحی کا مسئلہ یہ ہے کہ نصب العین حاصل کیسے ہوگا، اور انسانی علم کا مسئلہ یہ ہے کہ حقیقت کیا ہے ؟ علم بالوحی عمل کا علم ہے اس کا بنیادی تصوّر "اختیار" ہے اور انسانی علم کا بنیادی تصوّر "جبر" ہے

علم بالوحی کے مضمرات یہ ہیں : نصب العین کی جدّوجہد میں مزاحمت ہو اور مزاحمت کی مزاحمت سے نصب العین حاصل ہو۔ انسانی علم کے مضمرات یہ ہیں کہ ایک طرف ناظر ہو دوسری طرف منظور ہو۔ ناظر میں جاننے کی استعداد ہو اور منظور ایسا ہو جو ناظر کی استعداد سے جانا جا سکتا ہو۔ عمل کی ابتدا جس کے لئے علم بالوحی درکار ہے یقین سے ہوتی ہے۔ انسانی علم کی ابتدا شک سے ہوتی ہے۔ عمل میں جس کے لئے علم بالوحی نازل ہوا، ارادہ اہم ہے۔ انسانی علم میں فکر اہم ہے۔ عمل کا وظیفہ جس کے لئے علم بالوحی نازل ہوا، تخلیق ہے اور انسانی علم کا وظیفہ توجیہ ہے۔ عمل کا جائزہ حق و باطل کہہ کر لیا جاتا ہے اور علم کا جائزہ صحیح اور غلط کہہ کر لیا جاتا ہے ؛

علم بالوحی احتمالِ خطا سے پاک ہے اور انسانی علم میں احتمالِ خطا موجود ہے علم بالوحی بذلِ خالص اور فضلِ محض ہے انسانی علم میں کسب کو دخل ہے۔ علم بالوحی سے معاشرہ وجود میں آتا ہے، انسانی علم معاشرے میں پیدا ہوتا ہے۔ علم بالوحی جس یقین کا مطالبہ کرتا ہے، اس کی اساس بھی مہیا کرتا ہے اور انسانی

علم شک کی اساس فراہم کرتا ہے۔

انسانی ذہن کے زائیدہ دینی فکر کی نشوونما جس مسلمے پر ہوتی ہے وہ تکمیلِ دین کا خود ساختہ تصوّر ہے کہ تکمیلِ دستورِ حیات ہی تکمیلِ دین ہے اور یوں تکمیلِ دین فقہی دستورِ حیات تک محدود رہ جاتی ہے، جو فقہا کا کارنامہ ہے۔ قرآن مجید جس تکمیل کا دعویٰ کرتا ہے وہ رہنمائی ہے جس میں "وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ" کے باوجود غلبۂ دینِ حق کی ضمانت صرف دورِ رسالت میں نہیں دورِ مابعد رسالت میں بھی زوال کو عروج اور دین کی مغلوبیت کو غلبے میں بدلنے کی ضمانت ہو مگر مراسم پرستی کے زاویۂ نگاہ سے قانون سازی کے لئے قرآن سے رہنمائی طلب کرنے والا ذہن نتیجہ خیزی کا مطالبہ اس لئے نہیں کرتا کیونکہ وہ اوامر و نواہی کی خلاف ورزی کی صورت میں اپنے آپ کو زوال ہی کا سزاوار سمجھتا ہے۔ حالانکہ اوامر و نواہی کی خلاف ورزی مؤثراتِ زندگی یعنی علمِ اخلاق مذہب، معاشرت، معیشت، سیاست بدل جانے کی صورت میں اس لئے پیدا ہوئی کہ تاریخی انقلاب نے مؤثراتِ زندگی کی نوعیت بدل دی۔ اقتدار چھن جانے سے مذہب نظامِ حیات کے بجائے نجی زندگی کا مسئلہ اس لئے بن گیا کہ زندگی کے تقاضے لادینیت سے پورے ہونے لگے اخلاق مصلحت کوشی بن گیا۔ علم تمام تر حواس کے تابع متصوّر ہونے لگا معاشی انقلاب کی قیادت چھن جانے سے مخالف اسلام نظامِ معیشت کی پیروی لازم آگئی اور سیاسی اقتدار کا راستہ اس جمہوریت میں متصوّر ہونے لگا جو برطانوی استعمار کا ترکہ ہے اور ہوسِ اقتدار کی تسکین کا ذریعہ اور اسلامی ماحول سے بالکل مختلف ماحول میں ملوکیت کے مقابلہ میں عوام کے مطالبۂ حقوق کے طور پر جمہوریت کا نعرہ سامنے آیا ہے۔ جس کا موقف یہ ہے کہ اقتدار عوام کا حق ہے ——

معاشرتی زندگی میں عمرانی وحدت کے شعور کی بنیاد کلمۂ طیبہ کے بجائے جغرافیائی وفاداری اور وطن پرستی بن گئی ہے جس کے دائروں کا مفاد پرستی کی بنیاد پر تنگ سے تنگ تر ہوتے جانا خلافِ توقع نہیں ❖

زندگی میں کوئی صحت مند تبدیلی نصب العین کے حوالے کے بغیر نہیں لائی جا سکتی۔ نصب العین کے حصول کی جدّوجہد بغیر یقین کے نہیں ہو سکتی اور

کوئی سیاسی طالع آزما بے یقینی کا اعتراف کرنے کو تیار نہیں۔ ہر یقین و اعتماد کی ایک سنجیدہ اساس ضروری ہے۔ جو شخص قمار خانے کے قیام سے اپنی معیشت پیدا کرنا چاہتا ہے، اس کے لئے بھی کامیابی کا یقین ضروری ہے، جس کی اساس یہ ہوگی کہ جس معاشرے میں معیشت غیر یقینی ہو جائے اس کے افراد میں نفسیاتی تقاضا جوا کھیلنے کا پیدا ہوگا ؎

ہمیں قرآن کے دعووں کی صحت کے یقین کی اساس تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اوّلین مطالبہ ایمان بالغیب کا ہے جو اُن نتائج کے حاصل ہونے کا یقین ہے جو ابھی غیب میں ہیں، اس یقین کے بغیر سر دھڑ کی بازی نہیں لگائی جا سکتی۔ اسے مفسّرین نے مابعد الطبیعی حقائق کا یقین قرار دیا ہے، یعنی ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا یقین۔ ایمان باللہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں صرف اللہ کی ایک ذات، اس کا ایک نظام، اس کا ایک قانون اور اسی کی طاقت مؤثر ہے مگر جب تک حق اور باطل کا تصادم اتمام کو نہ پہنچے نہ باطل کے وجود کا انکار ہو سکتا ہے، نہ اس کے مؤثر ہونے کا۔ اگر حق و باطل کی کش مکش کے اتمام کو پہنچنے سے پہلے اعصابی تناؤ (TENSION) کو برداشت کرنے کی طاقت نہ رہے تو خوفزدہ ذہنی کو اس موقف میں پناہ لینی پڑتی ہے کہ سب یار کا جلوہ ہے کعبہ ہو کہ بت خانہ حالانکہ اس کی اساس کی جستجو کی جاتی تو حق و باطل میں سازگاری کی جستجو نہ کی جاتی ؎

اگر ہم قرآن سے نشو و نما کے قانون کی یعنی مقصد کے قریب تر ہوتے جانے کے قانون کی تشکیل اس کی خاصیّت اور اس کے وظیفے کی جستجو کرتے تو کامیابی کی ضمانت کا اعتماد مضمحل نہ ہوتا۔

یہ کائناتی قانون تضاد کا قانون ہے، جسے قرآن مجید ان الفاظ میں بیان کرتا ہے: جعلنا لکل نبی عدوًا من المجرمین ۝ اور ہماری سازگاری تلاش کرنے کی جدّ و جہد نے اس حقیقت کو ہماری نگاہ سے پوشیدہ کر دیا ہے، کہ مزاحمت کی مزاحمت ضمانت ہے۔ اس قانون کی خاصیّت ان الفاظ میں بیان

ہوتی ہے : لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا ۔ اور اس قانون کا وظیفہ مقصد کے قریب تر کرتے جاتا ہے۔ یہی قانونِ تضاد اس جدوجہد کے نتائج متعین کرتا ہے۔ جس کی جدوجہد تاریخ میں ہوتی ہے، جس کی تشکیل یہ ہے کہ دو گروہ ہوں :

حزب اللہ اور حزب الشیطان ⁂ اہل الجنّۃ اور اہل النّار

اصحابِ حق اور اصحابِ باطل ⁂ اصحاب یمین اور اصحاب شمال

اصحابِ میمنہ اور اصحابِ مشئمہ ⁂ دو وفاداریاں ہوں، ایمان اور کفر، حق اور باطل کی۔ دو منظم ادارے ہوں، حق و باطل کے لیے جن کے درمیان تصادم ہو۔ جماعتِ اسلام اور جماعتِ کفر، جن کے دو پروگرام ہوں : نفع بخشی اور مفاد پرستی۔ تخلیقی تعطّل رفع کرنے اور تخلیقی تعطّل پیدا کرنے کا، فیض رسانی اور مزعومہ مفاد کے لیے نفع بخشی کو روکنے کا۔ اس قانون کا وظیفہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے نتائج متعین کرتا ہے۔ جو ماورائی قانون سعادت و شقاوت پر عمل کرنے کا محرک ہے۔ اس قانون کی تشکیل یہ ہے : قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۔ وہ یقیناً فلاح پا گیا جو حرص و لالچ سے پاک ہوا اور وہ یقیناً تباہ ہو گیا جو حرص و لالچ میں مبتلا رہا۔ کیونکہ نشوونما دینے، فیض رسانی اور نفع بخشی پر فلاح پانے کا انحصار ہے۔ اور یہ تب ممکن ہے جب نفس حرص و لالچ سے پاک ہو جائے اور حرص و لالچ میں مبتلا رہنے کا لازمی نتیجہ مزعومہ مفاد کی خاطر فیض رسانی اور نفع بخشی کو روکنا ہے اور یہی تباہی کا موجب ہے۔

سورۂ محمدؐ کی آخری آیت کی رُو سے صرف انفاق میں بخل کرنے پر اقتدار سے محروم کر دیئے جانے کی وعید ہے۔ اگر تاریخی کش مکش میں پیغمبرانہ تعلیم سے انحراف کا موقف اختیار کرنے والوں کے طرزِ عمل میں نادانستہ بھی نفع بخشی کا پہلو ہمارے طرزِ عمل سے زیادہ ہو تو اُن کا طرزِ عمل مشیّت سے سازگار ہونے کی بناء پر ان کے حق میں نتائج پیدا کرتا ہے۔ اقوامِ عالم کی کسی قوم کے عروج و زوال کی توجیہ ان ہی تین کائناتی قوانین کی بناء پر کی جا سکتی ہے۔

اگر ہم اپنا جائزہ اس اصول کے تحت لیں کہ قانون سازی سے زندگی کے تقاضوں کی تکمیل کی راہ قرآنی وحی سے طلب کرنا ضروری ہے، جس کی احتیاج ابھی تک

قانون ساز مذہبی ذہن نے محسوس نہیں کی۔ اگر ہم خلافتِ ارضی کو قبل از مرگ زندگی میں سیاسی اور معاشی اعتبار سے نشوونما دینے کی نیابت کو سمجھتے اور شکست خوردگی کے احساس کے تحت اللہ تعالیٰ کی کامیابی کو بھی آخرت پر ملتوی نہ کر دیتے تو کبھی ان معترضانہ سوالات سے مضمحل ہو کر اسلام کی نتیجہ خیزی سے مایوس نہ ہوتے۔ مگر ہوا یہ کہ ہم نے غور و فکر سے اس مایوسی کی بنا پر کنارہ کشی اختیار کر لی کہ جب کہنے سے کچھ ہو نہیں سکتا تو سوچنے سے کیا فائدہ اور ہمارے ملک میں مستشرقین کی ذریت کی بدولت ریسرچ، گورکنی اور اُستخواں فروشی میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

ریسرچ کی جتنی شدید احتیاج آج پیدا ہو رہی ہے، پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ اس دور میں تمام مروّجہ علوم عقیم ہو گئے ہیں۔ اور علم بالوحی سے رہنمائی طلب کئے بغیر ہم اس بے یقینی سے نہیں نکل سکتے جس نے ہمیں جدید مکہ کی دریوزہ گری میں مبتلا کیا ہے۔

لسان العصر اکبر الہ آبادی مرحوم

کے کلام کو سمجھنے کے لئے

پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی تالیف

شرح تلمیحات و مشکلاتِ اکبر

کا مطالعہ اکسیر کا درجہ رکھتا ہے

قیمت فی نسخہ ..... -/۱۵ روپے (محصول ڈاک علاوہ)

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور سے طلب فرمائیں

نفاذِ شریعتِ اسلامی

اور

افرادِ معاشرہ کی ذمہ داریاں

از شیخ حیدر، ایڈووکیٹ سپریم کورٹ و پرنسپل سندھ مسلم لاء کالج کراچی

آج جب کہ قرآن کانفرنس عروس البلاد کراچی میں منعقد کی جارہی ہے - یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اعیانِ مملکت نفاذِ شریعت کا نہ صرف تہیّہ بلکہ اقدام کر چکے ہیں - اِس نوبت پر یہ مناسب ہوگا، اُن عوامل کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تاکہ وہ قدم جو نفاذِ شریعت کی طرف اُٹھ چکا ہے، آگے بڑھے اور حائل شدہ رکاوٹوں کو غور و فکر اور باہمی مشاورت سے دُور کیا جا سکے ؛

نفاذِ شریعت کے لازمی عوامل اجمالاً حسبِ ذیل بیان کئے جا سکتے ہیں :

(۱) شریعتِ اسلامی - (۲) اعیانِ مملکت یعنی وہ جو ہم میں صاحبِ اختیار ہیں یا ہوں گے - (۳) افرادِ معاشرہ -

(۱) <u>شریعتِ اسلامی :</u> "شریعتِ اسلامیہ" افرادِ معاشرہ کے جملہ اعمال اور افعال پر محیط ہے - خواہ اُن کا تعلّق اُمورِ مملکت سے ہو یا اُمورِ دینی و دُنیوی سے - شریعتِ اسلامی کا مُنتہا افراد کی اصلاح اور ملّت کو صحیح خطوط پر ڈھالنا ہے تاکہ ایسا معاشرہ تعمیر پائے جو منبعِ فلاح اور سرچشمۂ عدل ہو - اچھا معاشرہ نظم و ضبط کا باعث ہوتا ہے - غیر متوازن معاشرہ کائناتِ ارضی کو جہنّم میں تبدیل کر دیتا ہے - جہاں نہ قانون کی حکمرانی ہوگی اور نہ افرادِ معاشرہ کے جان، مال، عزّت اور عافیت کا تحفّظ ممکن - لہٰذا خداوندِ قُدّوس جو علیم و بصیر ہے اور جس کو آدم کی حیثیّت اور اُس کے طرزِ عمل کا ابدی علم ہے - یہ آدمِ خاکی جس نے اپنی آفرینش پر اُس کی کبریائی کی شہادت دی تھی اور جس کو بہ حیثیّت خلیفۂ ارضی پیدا کیا گیا ہے اور جو مستوجبِ جزا و سزا ہے - لہٰذا ذرّیتِ آدم کی ہدایت اور رہبری کے لئے انبیاء علیہم الصّلوٰۃ والسّلام

مبعوث ہوئے اور صحیفے نازل کئے گئے تاکہ صراطِ مستقیم اور راہِ ہدایت کی تعلیم دی جائے۔ اور یہ واضح کیا جائے کہ تعمیل کی صورت میں کیا جزاء ملے گی اور بصورتِ انحراف انسان کس سزا کا مستوجب ہوگا۔ اِس خصوص میں لاکھوں انبیاء مبعوث اور صحیفے نازل کئے گئے لیکن اجتماعی بے عملی اور انسانوں کی بے راہروی کی بنا پر تمام ہدایات بے معنیٰ ہو کر رہ گئیں۔ اِن حالات میں جبکہ انسانیت ظلمت کا شکار، معاشرۂ انسانی بے راہروی کے دلدل میں پھنس چکا تھا، نبی آخرالزّمان حضرت محمّد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم مبعوث کئے گئے جن پر آخری صحیفہ قرآنِ حکیم نازل کیا گیا۔ جو اللہ کی طرف سے روشن اور واضح کتاب ہے (سورۂ مائدہ ۵ : ۷) ہدایت کی گئی کہ تم "اُس کے موافق حکم کیا کرو!" اور جو سچی بات آپ کو ملی ہے، اُس کو چھوڑ کر اُن لوگوں کی خواہشات پر عمل درآمد نہ کیجئے!" اللہ تم کو دیئے گئے حکموں میں آزمانا چاہتا ہے، سو تم خوبیوں کی طرف دوڑو۔ (سورۂ مائدہ ۵ : ۴۸) اور بنی نوعِ انسان کو یہ مژدہ بھی سنایا گیا کہ: "وہی لوگ کامیاب ہیں جو نیک کام کرتے ہیں اور ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے!" (سورۂ بنی اسرائیل : ۹) ؂

قرآنِ حکیم کے نزول کا مقصد علم بہم پہنچانا، ہدایت بخشنا اور تکلیف دُور کرنا اور آسانیاں بہم پہنچانا ہے اور ارشاد ہوا کہ: "ہر چیز تفصیل سے بیان کر دی گئی ہے!" (سورۂ بنی اسرائیل : ۱۲) اور: "جسے ہلاک ہونا ہے وہ دلیل سے بے اعتنائی برت کر ہلاک ہو اور جسے جینا ہے وہ دلیل مان کر جیئے!" (سورۂ انفال : ۴۲) ؂

بحیثیت مسلمان یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآنِ حکیم آخری صحیفہ اور ایک کامل کتاب ہے جو روزِ قیامت تک باقی اور جاری و ساری رہے گی ؂

کتابِ ہدایت کے نزول کا مدّعا انسانوں کی رہبری اور تعلیم ہے۔ لہٰذا قرآنِ مبین نبی آخرالزّمان محمّد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نازل کیا گیا اور حضور انور صلّی اللہ علیہ وسلّم بحیثیتِ معلّمِ انسانیّت نے اپنے فعل، عمل، تقریر اور فیصلہ جات کی رُو سے زندگی پر محیط تمام مسائل کی تعلیم دی، خواہ مسائل متعلّق بہ اوامر ہوں یا نواہی، دینی ہوں یا دُنیوی! لہٰذا اجمالاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی شریعت کے ابتدائی اور بنیادی ماخذ قرآنِ حکیم اور سُنّتِ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔ اس نے

موقعہ پر یہ صراحت لازم ہے کہ خود دورِ رسالت میں بہت سے ایسے مسائل حالات پیدا ہوئے جو بغرضِ انفصال مختلف صحابہؓ کے سپرد کئے گئے اور عامل اور گورنر مقرر کئے گئے۔ اس خصوص میں حضورِ انور صلّی اللہ علیہ وسلّم اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے درمیان بوقتِ روانگی یمن جو گفتگو ہوئی وہ درج ذیل ہے :

: آپ ؐ نے دریافت فرمایا کہ معاملات ، مقدّمات اور نزاعات کا کس طرح انفصال فرمائیں گے ، جواباً آپؓ نے عرض کیا بموجب قرآنِ حکیم - فرمایا ؐ اگر اس میں نہ پاؤ ، عرض کیا ؓ بموجب سُنّتِ رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم - آپ ؐ نے فرمایا اگر اس میں بھی نہ پاؤ ، جواباً عرض کیا ؓ قرآن اور سُنّت کی روشنی میں اجتہاد کروں گا- کہا جاتا ہے ، اِس جواب با صواب کو سُن کر حضورِ انور صلّی اللہ علیہ وسلّم مسرور اور مطمئن ہوئے اور ربّ العزّت کا شکریہ ادا کیا ؛

علاوہ ازیں احکام ، ہدایات اور فیصلہ جات خلفاءِ راشدین بحیثیت اجماعِ صحابہؓ تمام مکاتبِ فقہی میں اہم ماخذ تسلیم کئے جاتے ہیں- علاوہ ازیں مختلف مکاتبِ فقہ کی جانب سے جو خدمات مختلف ادوار میں انجام دی جاتی رہیں ، اُن کا احاطہ اس مضمون میں ممکن نہیں ، لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ تمام مسائل جو وقتاً فوقتاً پیدا ہوا کرتے ہیں ، اُن کا حل قرآنِ حکیم ، سُنّتِ نبوی ، اجماعِ صحابہؓ اور بذریعہ اجتہاد کیا جاتا ہے ؛

لیکن اسلامی سیاست کے انحطاط اور زوال پذیری کا براہِ راست اثر فقہ اسلامی پر بھی ہوا - اجتہاد کی جگہ تقلید کا مسلک اختیار کیا گیا اور اجتہاد فی المسائل کا سلسلہ بڑی حد تک منقطع اور مسدود ہوا- چنانچہ مسلمانانِ برِ اعظم ہندوستان اِس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے- بہرحال مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کی تعلیمات اور حضرت مجدّد الفِ ثانی رحمتہ اللہ علیہ کی مساعی کے نتیجے کے طور پر مسلمانانِ ہند میں اسلامی شریعت کے تحفّظ اور حیثیتِ حاکمہ کے قیام کا جذبہ بیدار ہوا اور نتیجتاً پاکستان کا قیام عمل میں آیا - قیامِ پاکستان کا بنیادی مقصد اسلامی شریعت ، اسلامی ثقافت کا نفاذ اور تحفّظ تھا- لیکن افسوس کہ یہ مسائل ، تقاریر اور بنیادی اصولوں کے تعیّن سے آگے نہ بڑھ سکے- لیکن اب جب کہ نفاذِ شریعت کا

تصفیہ کیا گیا ہے حسب ذیل امور کی جانب فوری توجّہ دی جائے ورنہ راہ سنگلاخ اور اندیشے لامحدود :

(۱) عربی زبان کی تعلیم تمام مدارس اور مساجد میں لازم قرار دی جائے۔

(۲) بسلسلۂ ترویج زبانِ عربی تعلیم بالغاں (ابتدائی و ثانوی) کا عام انتظام حتی الوسع ہر محلّہ، ہر مسجد اور ہر دیہات میں کیا جائے، تاکہ عوام کو بنیادی معلومات فراہم کی جاسکیں ۔

(۳) عدالت ہائے شرعیہ قائم کی جاچکی ہیں، کوتاہیوں اور خامیوں سے سب واقف ہیں۔ لہٰذا اس عبوری دور میں ضرورت ہے کہ مستند کتب، تفسیر، فقہ، حدیث کے تراجم بزبانِ اُردو شائع کئے جائیں اور تاوقتیکہ ان کے اشاریہ (انڈکس) تیار ہوں ان کتب کا استعمال ممکن نہیں۔ مذکورہ تجاویز ابتدائی اور بنیادی ہیں لیکن زیادہ اندیشہ ایسے تعلیم یافتہ طبقہ سے ہے جو مذہب کو ذاتی مسئلہ سمجھتا ہے، اور بربنائے لاعلمی یہ محسوس کرتا ہے کہ فقہ اسلامی حالات حاضرہ کے مسائل کے لئے محیط اور جامع نہیں۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ حکومت اور تعلیمی اداروں کی جانب سے مخصوص توسیعی تقاریر کا انتظام کیا جائے۔ اس مسئلہ میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے نیشنل سنٹر قائم ہیں۔ اُن پر یہ ذمّہ داری منجانب حکومت بآسانی عائد کی جاسکتی ہے تاکہ ایسے طبقہ کا احساسِ کمتری دُور کیا جاسکے اور انہیں یہ محسوس کرایا جائے کہ ہر وہ قانون جو ملک میں نافذ ہے اگر وہ اوامر و نواہی کے متناقض نہیں تو بحیثیتِ قانونِ مملکتِ اسلامیہ نافذ، جاری اور ساری رہ سکتا ہے ۔

نفاذِ شریعتِ اسلامیہ کے سلسلہ کی دوسری اہم ترین کڑی اُولی الامر منکم ہیں۔ جہاں تک موجودہ اربابِ حلّ وعقد کا تعلّق ہے، اُن میں جذبۂ نفاذ شریعت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اور نفاذ کی جانب حتی الوسع عملی اقدامات کی مخلصانہ کوشش کی جارہی ہے۔ حالات موجودہ خاطر خواہ اور اطمینان بخش ہیں اور النّاسُ علیٰ دِینِ مُلُوکِھِمْ کا مفہوم پیش کررہے ہیں۔ البتّہ مستقبل کا انحصار مملکتِ پاکستان کے بالغ رائے دہندگان پر ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ افرادِ معاشرہ کی تعلیم، اور تربیت ایک دقیقہ ضائع کئے بغیر صحیح خطوط پر کی جائے تاکہ نفاذِ شریعتِ اسلامی

کے سلسلہ میں ہر قدم آگے کی طرف بڑھتا رہے۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ قرآنی تعلیمات کی رُو سے ایک مسلمان فرد کو کیا اور کیسا ہونا چاہیئے تاکہ تعامل و ہمکاری کا جذبہ بہ سلسلہ نفاذِ شریعتِ اسلامی بیدار اور رجاری و ساری رہے۔ بموجب تعلیماتِ قرآن مسلمان فرد کو کیا ہونا چاہیئے۔ اللہ رب العزت نے انسان کو بحیثیت خلیفۃ الارض پیدا کیا، لہٰذا افراد اس امر کے مستوجب ہیں کہ وہ اپنے افعال اور اعمال سے کائناتِ ارض و سما میں اسرارِ الٰہیہ کو وا کریں فرد کا اندازِ فکر، عمل کی پاکیزگی اور سیرت کی بلندی اس امر کی شاہد ہو کہ وہ احکامِ الٰہیہ کا پابند اور تنفیذِ احکامِ شرعیہ اُس کا مقصدِ حیات ہے۔ افراد پر لازم ہے کہ وہ اپنے معمولات سے خدا کے نائب ہونے کا ثبوت دیں ؛

فرد فی الاصل معاشرہ کا ایک معیار ہے۔ فرد سے معاشرہ کی حیثیت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ افراد کو منقلب کیا جائے تاکہ وہ صحیح معنیٰ میں تعلیماتِ قرآنی کے عکّاس ثابت ہوں ؛

قرآنِ حکیم میں کہا گیا ہے کہ تمھیں خلیفۃ الارض بنایا گیا۔ کائناتِ ارضی کو مسخّر کیا گیا، بحر و بر پر سواری بخشی گئی، مخملیں فرش بچھایا گیا، سطحِ زمین کے توازن کو برقرار رکھنے کے لئے جا بجا پہاڑ رکھ دیئے گئے، زمین سے خوشنما پھول، ذائقہ دار پھل پیدا کئے گئے۔ ہوا اور پانی کا بندوبست کیا گیا اور جانور اور پرند تمھاری سواری اور خوراک ہیں۔ بتایا گیا کہ کون حرام اور کیا حلال ہے اور اجازت دی کہ تمام چیزیں جو پاک اور طیّب ہیں کھاؤ۔ ایسی چیز جو جس سے حواس گم ہوں، ہدایت کی گئی کہ اجتناب کرو، نہ کھاؤ، نہ پیو ؛

لباس : ایسا لباس پہنو جس سے جان کا تحفظ ہو۔ اور موسم کی شدّت سے بچ سکو۔ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہ واضح فرمایا کہ مرد اور عورت کا کیسا لباس ہو، کس طرح ستر پوشی کی جائے، لباس کا مقصد تفاخر نہ ہو۔ زیب و زینت ناروا نہیں۔ کون سا لباس اور زیور عورت کے لئے موزوں ہے اور مرد کے لئے ناموزوں؛

نکاح : غذا و لباس کے بعد ہر فرد خواہ مرد ہو یا عورت جنسی احتیاج محسوس کرتا ہے۔ قبل اسلام نکاح کی کوئی تحدیدات نہ تھیں، لہٰذا واضح احکام دے کر

بتایا گیا کہ چار تک نکاح کی اجازت بشرطِ عدل دی گئی۔ بر بنائے رشتۂ خونی رضاعت اور مصاہرت ممنوعاتِ نکاح کا تعین کیا گیا۔ چار سے زائد نکاح ممنوع ہیں۔ ٭

زوجہ کو ہدایت کی گئی کہ اپنی ذات کو اپنے زوج کے لئے محفوظ رکھے کسی غیر کو بستر پہ نہ آنے دے۔ احسن طریق پہ برتاؤ کی ہدایت کی گئی۔ بصورت ناہمواری ایک مکمل ضابطہ بغرض انفساخ نافذ کیا گیا۔ دورانِ ازدواج، دورانِ رضاعت مابعد طلاق زوجین کے حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین کیا گیا اور ہر نوبت پر ہدایت کی گئی کہ احسان کا برتاؤ کرو یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ ٭

یتیم: اسلامی قانون میں مطلقہ اور بیوہ عورت سے نکاح کی اجازت ہے لہذا اس سلسلہ میں یتیموں اور ان کے مال کے تحفظ، برتاؤ اور ذمہ داریوں کے متعلق صریح احکام دیئے گئے۔ ہدایت کی گئی کہ یتیموں کا مال مت کھاؤ اور اپنے مال کے ساتھ مت ملاؤ۔ جب یتیم بالغ ہوں اُن کا مال واپس کرو تو گواہ کر لو ٭

امانت اور معاہدات: حکم دیا گیا کہ امانت والوں کو امانت واپس کرو اور معاہدہ کی پابندی کرو ٭

راست بازی: راست بازی کی ہدایت کی گئی۔ حکم دیا گیا کہ "مت ملاؤ سچ کو جھوٹ کے ساتھ مت چھپاؤ حق کو اور تم جانتے ہو!" (بقرہ ۲) "اے اہلِ ایمان ڈرتے رہو اللہ سے اور راست بازوں کے ساتھ رہو!" (توبہ ۱۸) ــــ راست بازی کے فقدان کی صورت میں فرد کی حیثیت متاثر ہوتی ہے، معاشرہ ابتری کا شکار ہوتا ہے اور عدل گستری ناممکن ہو جاتی ہے۔ ٭

کاروبار: کاروبار کے تعلق سے ایک بنیادی نکتہ یہ بیان کیا گیا کہ جس معاملہ کی بنیاد جور و ستم پہ ہو وہ ناروا ہے۔ یہاں لفظ جور اور ظلم وسیع تر مفہوم میں مستعمل ہیں۔ عیب کا اخفاء کرنا، ملاوٹ کرنا، صحیح کیفیت اور کمیت کا اظہار نہ کرنا، کم تول کر دینا، زیادہ ناپ کر لینا ممنوع ہیں ٭

عدالت: لفظ "عدل" اسلامی شریعت میں وسیع تر مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا اعمال، افعال، حرکات و سکنات ذاتی میں عدل کی ہدایت کی گئی ہے۔ معاشرتی، خاندانی، دینی اور عدالتی مسائل میں عدالت اور راستبازی کی ہدایت کی

گئی۔ کہا گیا ہے کہ حاکم پر لازم ہے کہ عدل کرے بلا لحاظ اس کے کہ فریق مطعون اُس کا عزیز کیوں نہ ہو۔ گواہ کو حکم دیا گیا کہ جو کچھ معلوم ہے، دیکھا ہے، سچی گواہی دو اور اجتناب نہ کرو، ملاوٹ یا ازدیاد نہ کرو ۞

<u>صوبہ و فرقہ پرستی</u>: اولادِ آدم کو گروہوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا گیا تاکہ تم شناخت کئے جا سکو۔ بالآخر حضورِ انور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حجۃ الوداع میں فرمایا کہ اے لوگو! سود منسوخ کرو، عدل کرو، راست باز رہو، تمہاری قبیلہ وار تقسیم بغرضِ شناخت ہے، کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں اور تم میں سب سے زیادہ مکرّم وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔ افراد کو ہدایت کی گئی کہ کسی کے حق میں بُرا گمان نہ کرو شاید وہ تم سے بہتر ہو، عیب جوئی نہ کرو، تہمت نہ لگاؤ، تمسخر نہ کرو، احسان اور عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ یہ وہ چند امراضِ خبیثہ ہیں جو ملّتِ اسلامیہ میں سرایت اور بنیادوں کو کھوکھلا کر چکی ہیں۔ اِن امراض کے سدِّ باب کے بغیر نفاذِ شریعت کی راہ نہایت سنگلاخ ثابت ہو گی۔ بالآخر سورۃ النّساء کی اِس آیت پر مَیں اِس مضمون کو ختم کرتا ہوں:

"لوگو! تمہارے ربّ کی طرف سے تمہارے پاس روشن دلیل آ گئی ہے اور ہم نے تمہاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمہیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے۔ اب جو لوگ اللہ کی بات مان لیں گے اور اُس کی پناہ ڈھونڈیں گے، اُن کو اللہ اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم کے دامن میں لے لیگا اور اپنی طرف آنے کا سیدھا راستہ اُن کو دکھائے گا!"

(سورۃ النّساء ۱۷۴-۱۷۵)

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف!

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ط لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ط
وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

۞

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ

قرآن کا معاشرتی نظام

از

پروفیسر محمد اسلم، اُستاذ شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور

قرآن مجید ایک مکمل نظامِ حیات اور ضابطۂ اخلاق ہے۔ یہ اُن تمام الہامی کتابوں کی تعلیمات کا نچوڑ ہے، جو اس سے قبل نازل ہوئیں۔ اس میں تمام اولادِ آدم کے لئے ہدایت ہے ـــــ قرآن مجید جس معاشرے کا داعی ہے اُس کی مثال کوئی دوسرا ازم یا شرم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ کا دور صحیح قرآنی معاشرے کی عکاسی کرتا ہے ؛

اللہ تبارک و تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان سیکولرازم اور سوشلزم کو خیرباد کہہ کر اب پھر اسلام کی طرف لوٹ رہے ہیں اور انہیں اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ اُن کے جملہ دکھوں کا مداوا صرف اور صرف ہدایت کے سرچشمے قرآن مجید کی تعلیمات پر عمل کرنے اور خیر القرون کی طرف لوٹنے میں ہے ؛

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی روشنی میں حُقوق اللہ اور حقوق العباد متعین فرما دیئے ہیں اور وراثت میں وارثوں کے حصّے مقرّر کر دیئے ہیں۔ جن میں کمی بیشی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رکھی۔ اسلام نے مرنے والے کو وصیّت کا حق دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی حد مقرّر کر دی ہے کہ وہ ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیّت نہیں کر سکتا۔ اِس حکم میں یہ حکمت پنہاں ہے کہ جن رشتہ داروں کو مثلاً یتیم پوتوں اور پوتیوں کو اپنے دادا کی جائداد میں سے کوئی حصّہ نہیں ملتا۔ اُن کی تعلیم و تربیت کے لئے اُن کے دادا کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی جائداد میں سے ایک تہائی تک اُن کے حق میں وصیّت کر جائے ؛

اسلامی معاشرے میں تزکیۂ نفس اور تربیت پر بڑا زور دیا گیا ہے اور قرآن پاک نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جن چار فرائضِ منصبی کا ذکر کیا ہے، اُن میں ایک

تزکیۂ نفس بھی ہے۔ اس کے بغیر تعلیم اور تربیت بیکار ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب تک اپنے اصحاب کا تزکیہ نہیں کر لیا اُس وقت تک انہیں کتاب اللہ، اور حکمت کی تعلیم نہیں دی۔ ہماری تعلیم اس لئے دن بدن تنزّل پذیر ہے کہ اُس میں تزکیۂ نفس اور صحبتِ صالح کو کوئی مقام نہیں دیا گیا ؛

اسلامی معاشرے میں عورتوں کے حقوق کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی تعلیم و تربیت پر بڑا زور دیا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ فرمان کون نہیں جانتا کہ جس شخص کو اللہ تبارک و تعالیٰ بیٹیاں عطا کرے اور وہ ان کی کما حقہٗ تربیت کرے اور جب وہ سنِ بلوغ کو پہنچیں تو ان کا نکاح کر دے تو قیامت کے دن وہ بچیاں اپنے باپ اور جہنّم کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو جائیں گی ؛

عورتوں کی اصلاح کی خاطر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۃ الممتحنہ میں یہ حکم دیا گیا ہے :

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ ۔

(الممتحنہ : ۱۲) ۔ عورتوں کے باہمی جھگڑے عام طور پر چوری، بدکاری، بہتان تراشی اور شرک و بدعت کی بنیاد پر ہی ہوا کرتے ہیں۔ اِس لئے اسلام نے اُن سے اِن اُمور سے اجتناب کرنے کا عہد لے کر نسوانی جھگڑوں کی بنیاد ہی کو ختم کر دیا ہے ؛

ہندوؤں کے ساتھ صدیوں سے مل جل کر رہنے کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں بیوہ اور مطلّقہ کے ساتھ نکاح کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ پنجاب کے دیہات میں اگر کوئی بیوہ اپنے مالی اور سماجی مسائل کے حل کے لئے عقدِ ثانی کرے تو اُس گاؤں کے کلمہ گو مسلمان اُس نیک بخت سے ملنا جلنا ترک کر دیتے ہیں۔ اور بڑی حیرت سے ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ فلاں عورت نے فلاں مرد کے ساتھ "حق" کر لیا ہے۔ یاد رکھئے کہ نکاح بیوگان کے بارے میں یہ حکم ہے :

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ

فِیْ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ) خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوہ عورتوں سے نکاح کر کے ایک بہترین مثال قائم کی ہے ٭

اسلام نے ایک شخص کو یہ حق دیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنی وفات سے قبل یہ وصیت کر سکتا ہے کہ اُس کی بیوہ ایک سال تک اُس کے گھر میں بلا روک ٹوک رہ سکتی ہے اور اُسے اُس کے ترکے میں سے باقاعدہ نان و نفقہ ملتا رہے گا۔ اس ضمن میں ارشاد باری ہے: "وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِیَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَی الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ فِیْ مَا فَعَلْنَ فِیْ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ (البقرہ ۲۴۰) ٭

اسلام میں بوقتِ ضرورت جہاد فرض ہے۔ عہدِ رسالت اور عہدِ خلفائے راشدین میں غزوات و سرایا میں بڑی تعداد میں لوگ شہید ہوئے۔ اُن شہداء کی بیوگان کے مالی اور سماجی مسائل کے حل کے لئے نکاحِ بیوگان ضروری تھا۔ اس لئے اسلام نے بیوہ کے ساتھ نکاح کو معیوب کی بجائے مستحسن فعل قرار دیا ہے۔ جن مذاہب میں جہاد کا کوئی تصوّر نہیں، اُن کے ہاں نکاحِ بیوگان پر پابندیاں عائد ہیں۔ ہندوؤں نے بیوہ کو مردہ خاوند کے ساتھ جل مرنے پر مجبور کیا اور نکاحِ بیوگان کو بڑا معیوب جانا۔ اسلام نے جس انداز سے بیوگان کے مسئلے کو حل کیا، اُس کی نظیر دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی ٭

"یدِ بیضا" میں مرقوم ہے کہ جب خلیفہ غلام محمد دین پوری نوّر اللہ مرقدہٗ نے بہاولپور کے علاقے میں اصلاحی مہم شروع کی تو اُس علاقے کے زمینداروں نے نکاحِ بیوگان کی مخالفت کی۔ اِس پر خلیفہ صاحب نے فرمایا: "اگر تمھاری حویلیوں کی ڈیوڑھیوں کو کھُدوایا جائے تو وہاں سے نوزائیدہ بچّوں کے ڈھانچے برآمد ہوں گے۔ اِس کے باوجود تم نکاحِ بیوگان کی مخالفت کر رہے ہو!" ٭

مسلمانوں کے جن ممالک میں اسلامی قوانین نافذ ہیں اور لوگ اسلام کی حقیقی روح سے واقف ہیں، وہاں طلاق دینے یا مطلّقہ عورت سے نکاح کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی جاتی۔ ہمارے معاشرے میں ہندوانہ اثرات کے تحت طلاق لینے والی عورت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اور ذات برادری میں اُس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ مطلّقہ عورت کے ساتھ نکاح کو بھی مستحسن فعل نہیں سمجھا جاتا اور کوئی شخص اپنے بیٹے کو

مطلقہ عورت کے ساتھ نکاح کرنے کی برضا و رغبت اجازت نہیں دیتا۔ اسلام میں نکاح ایک سوشل کنٹریکٹ (عمرانی معاہدہ) ہے اور اگر میاں بیوی میں باہمی عہد پیمان قائم نہیں رہ سکتا تو وہ اس معاہدے کو توڑ کر آزاد ہو سکتے ہیں۔ مطلقہ عورت اپنے مالی اور سماجی مسائل کے حل کے لئے عدت گزار کر جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے اور اُسے عقدِ ثانی سے روکنا احکامِ قرآنی کے خلاف ہے اور اُسے عقدِ ثانی سے روکنے والا نعوذ باللہ خدا کے نزدیک اللہ اور یوم آخرت پر یقین نہیں رکھتا، ارشادِ باری ہے :-

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ (البقرہ : ۲۳۲) ؁

جن مذاہب میں طلاق کا تصور نہیں ہے، اُن مذاہب کے پیرو بعض اوقات بڑی سخت اُلجھن میں پڑ جاتے ہیں۔ راقم الحروف نے یورپ میں طویل قیام کے دوران میں یہ مشاہدہ کیا ہے کہ رومن کیتھولک فرقے میں طلاق کا تصور نہیں ہے۔ اس لئے جب کبھی میاں بیوی میں جھگڑا ہو جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس صورت میں وہ عدالت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور سِوَل لاء کے تحت اُن کے درمیان طلاق ہو جاتی ہے۔ لیکن رومن کیتھولک کلیسا عدالت سے حاصل کردہ طلاق کو تسلیم نہیں کرتا۔ اِس لئے جب مطلقہ عورت عقدِ ثانی کرتی ہے تو کلیسا اُس نکاح کو تسلیم نہیں کرتا۔ مزید برآں دوسرے خاوند سے ہونے والی اولاد کلیسا کی نظر میں پہلے خاوند ہی کی اولاد سمجھی جائے گی۔ اس صورت میں نسب و ولا کے جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہمارا یہ موقف ہے کہ جو دین ایک مرد اور عورت کو میاں بیوی کے مقدّس رشتے میں منسلک کر سکتا ہے اُسے مخصوص حالات میں انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنے کا بھی اختیار ہے ؁

ہمارے ملک میں خصوصاً سندھ اور بہاول پور کے علاقوں میں نکاحِ شغار کا رواج ہے اور اِس کے بغیر ان علاقوں میں نکاح نہیں ہو سکتا۔ اس طرح نکاح کرنے سے بسا اوقات بڑے پیچیدہ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر ایک جوڑے میں نباہ نہ ہو سکے تو دوسرا جوڑا خواہ مخواہ اپنا گھر تباہ کر لیتا ہے۔ شارع علیہ الصّلوٰۃ والسّلام

نے نکاحِ شغار کے بارے میں فرمایا ہے : لَا شِغَارَ فِي الْاِسْلَامِ ط اسلامی معاشرے میں عائلی زندگی کو خوشگوار اور کامیاب بنانے کے لئے علمائے کرام کو چاہیئے کہ وہ نکاحِ شغار کے خلاف مہم چلائیں اور ایسا نکاح پڑھانے سے صاف انکار کر دیں جہاں بقول اہلِ پنجاب "ٹے سٹے" کا معاملہ ہو ؛

یتامیٰ : نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم خود یتیم پیدا ہوئے تھے ، اس لئے آپؐ کو یتیموں کا بڑا خیال رہتا تھا۔ قرآنِ پاک میں کئی مقامات پر یتیموں کے ساتھ صلۂ رحمی کرنے کا حکم موجود ہے۔ سورۃ الضحیٰ میں حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو یہ حکم دیا گیا ہے :-
فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ (سورۃ الضحیٰ : ۹) "یعنی تم بھی یتیم پر ستم نہ کرنا !"—
سورۃ الماعون میں یتیم کو دھکّے دینے والے شخص کو روزِ جزاء کا منکر بتایا گیا ہے :-
اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ یتیم کی تربیت اور اصلاح کی خاطر اس کی ماں کے ساتھ نکاح کو مستحسن فعل قرار دیا گیا ہے یتیم کے مال کو ہضم کرنے والے کے لئے سورۃ النّساء میں بڑے سخت الفاظ میں تنبیہ آئی ہے : (سورۃ النساء : ۲)۔ اِسی طرح اُس کے مال کو اپنے مال میں ملا کر کھانے سے بھی منع کیا گیا ہے (سورۃ النساء : ۲) یتیم بچّی کو پال کر اُس کے ساتھ نکاح کرنے کو بھی اچھی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ اسلام نے جس طریقے سے یتیم بچّوں کے مسائل حل کئے ہیں اور جس طرح سے انہیں اسلامی معاشرے کا ایک کارآمد فرد بنایا ہے ، اُس سے بہتر حل کسی دوسرے ازم یا سسٹم نے پیش نہیں کیا ؛

بدکاری : ایوب خان مرحوم کے دورِ حکومت میں عائلی قوانین نافذ کئے گئے۔ یہاں اُن کے فوائد و قبائح سے بحث نہیں ، البتّہ اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ اِن قوانین کے نفاذ سے عملاً بدکاری کو فروغ ملا۔ قرآنی معاشرے میں نکاح بہت آسان بنایا گیا۔ امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک اگر ایک بالغ مرد اور بالغ عورت دو گواہوں کے سامنے ایجاب وقبول کر لیں تو نکاح ہو جاتا ہے۔ کسی پیشہ ور نکاح خوان سے خطبہ پڑھانے کی ضرورت نہیں - امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک اگر مرد اور عورت میاں بیوی ہونے کا اعلان کر دیں تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے ، کیونکہ اُن کے نزدیک اعلان ہو جانا ہی کافی ہے۔ ہم نے برصغیر پاک و ہند میں ہندوانہ رسم و رواج اپنا کر نکاح کو

سب سے مشکل کام بنا دیا ہے۔ آج ہمارے گھروں میں جوان بیٹیاں محض اس لئے بیٹھی ہوئی ہیں کہ ہم ذات برادری کے رسم و رواج پورے کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔

سورۃ الفرقان میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ایک خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ وہ زنا نہیں کرتے۔ قرآنی معاشرے میں غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کو سو سو دُرّے لگا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ لیکن شادی شدہ زانی اور زانیہ کے لئے قرآنی معاشرے میں زندہ رہنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسلام نے نسب اور ولا کی بڑی حفاظت کی ہے، اس لئے زنا کو سب سے بڑی فحاشی قرار دے کر اس کے قریب جانے سے بھی روکا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا (سورۂ بنی اسرائیل: ۳۲) — اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کی یہ پہچان بتائی ہے کہ وہ اس کی مقرر کردہ حدود کی حفاظت کرتے ہیں اور اُن کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔

پاکستان میں قانون بنانے اور نافذ کرنے والے اداروں سے ہماری یہ استدعا ہے کہ وہ زانی کو قرآن کے حکم کے مطابق ضرور سزا دیں لیکن اِس سے پہلے نکاح کو آسان بنائیں تاکہ لوگ زنا کے قریب بھی نہ پھٹکیں۔ ہمارے ہاں مروّجہ عائلی قوانین نے نکاح کو مشکل اور زنا کو آسان بنا کر معاشرے میں بدکاری کو فروغ دیا ہے۔

قرآنِ حکیم نے بدکار عورت اور نیک عورت کے پیوند کو یا نیک عورت اور بدکار مرد کے نکاح کو بنظرِ استحسان نہیں دیکھا۔ سورۃ النّور میں یہ حکم موجود ہے کہ بدکار عورت کا بدکار مرد کے ساتھ ہی نکاح ہونا چاہیئے۔ ارشادِ باری ہے:

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (النّور: ۳)۔ قرآن مجید یہ نہیں چاہتا کہ ایک نیک مرد کسی بدکار عورت کی صحبت میں رہ کر بدکار ہو جائے اس لئے قرآنِ حکیم نے یہ قاعدہ کُلیّہ بتایا ہے:

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ (سُورۃ النّور: ۲۶)

اسلام نے دولت کے ارتکاز کو جائز قرار نہیں دیا۔ اسلامی معاشرے میں اگر دکھے

لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (سورۃ الحشر: ۷) کی نصِّ قرآنی پر عمل کیا جائے تو دولت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی۔ زکوٰۃ و صدقات اور خراج و عشر کی سال بسال وصولی کے بعد بھی جو دولت بچ جاتی ہے وہ ایک شخص کی وفات کے بعد اس کے ورثاء میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اِس لئے اسلام کے مالی نظام پر عمل کرنے سے نہ ہی تو کوئی شخص نسلاً بعد نسلٍ سرمایہ دار رہ سکتا ہے اور نہ ہی جاگیردار۔ اگر ابتدا ہی سے وطنِ عزیز میں قرآنی احکام پر عمل ہوتا تو ہمارے ملک کا سرمایہ صرف بائیس[۲۲] خاندانوں میں محدود ہو کر نہ رہ جاتا +

اسلام نے جائز طریقے سے دولت کمانے کی مخالفت نہیں کی لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا صحیح مصرف بھی بتایا ہے۔ ایک جگہ "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" کہہ کر دولت میں دل نہ لگانے کی تلقین فرمائی تو دوسرے مقام پر نیکی کا معیار "وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ" (البقرہ: ۱۷۷) قرار دے کر معاشرے کے اِن پس ماندہ اور محتاج افراد پر مال خرچ کرنے کا حکم دیا ÷

اسلام نے دولت کے فضول اسراف پر قدغن لگائی ہے۔ سورۃ الفرقان میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی ہے کہ وہ نہ ہی بے جا بُخل سے کام لیتے ہیں اور نہ ہی فضول خرچ ہوتے ہیں بلکہ اُن کا مسلک میانہ روی ہوتا ہے "وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا" (الفرقان: ۶۷)

قرآن مجید نے بُخل کی مذمت کی ہے اور مال جمع کرنے اور رقم گن گن کر رکھنے والے کے لئے خرابی بتائی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ آپؐ سائل کو جھڑکیں بلکہ اُس کی حاجت روا کریں: "وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ" (سورۃ الضحیٰ: ۱۰) جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کی فضیلت بتائی تو صحابہ کرامؓ نے سوال کیا کہ وہ کس قدر مال خرچ کریں تو اس موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی:

"وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ" (البقرۃ: ۲۱۹)

بعض بے دینوں نے یہ کہنا شروع کیا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے حضرت عثمان غنی رضؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ اور حضرت زبیر بن العوام بہت بڑے سرمایہ دار تھے، لیکن وہ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اُن کی دولت اسلام ہی کے کام آئی اور اُن کے مال سے اُس عہد کے معاشرے کو کس قدر فائدہ پہنچا۔ انہیں حضرت عثمان غنی رضؓ کا وہ قول یاد نہیں جو انہوں نے اپنی شہادت سے قبل سبائیوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ تم جانتے ہو کہ میں قریش میں سب سے امیر آدمی تھا، اب میرے پاس صرف دو اونٹنیاں باقی رہ گئیں جو میں نے سفر حج کے لئے رکھی ہوئی ہیں۔ ایسی دولت جو اسلام اور مسلمانوں کے کام آئے، اسے جمع کرنے سے کون منع کرتا ہے؟ ؎

اسلام نے ہمسائے کا حق تسلیم کیا ہے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ صحابہ کرام رضؓ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمسائے کے حقوق پر اتنا زور دیا کہ انہیں اِس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ اُس کے حقوق کے بارے میں یا اُسے وراثت میں حصّہ دار بنانے کے بارے میں آیات نازل ہونے والی ہیں۔ قرآن مجید کا حکم ہے کہ اگر کسی شخص کو روزمرّہ استعمال کی کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ چیز سائل کو فوراً مہیّا کی جائے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے استعمال کی چیز مستعار نہ دینے والے کے لئے خرابی بتائی ہے۔ (سورۃ الماعون: ۷)

اسلامی معاشرے میں ناپ تول کے پیمانے صحیح رکھنے پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ سورۃ الرّحمٰن میں پورا تولنے اور ڈنڈی نہ مارنے کا حکم دیا گیا ہے۔ "اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ ۝ وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ ۝" (الرّحمٰن ۸:۹) ؎ اسی طرح سورۃ المطفّفین میں کم تولنے والے کی تباہی کی پیش گوئی کی گئی ہے: وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا کَالُوْھُمْ اَوْ وَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ ۝ (المطفّفین ۲:۳) - سورۂ بنی اسرائیل میں یہ حکم دیا گیا ہے: وَاَوْفُوا الْکَیْلَ اِذَا کِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ ۝ (۳۵) قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت کا ایک مقصد یہ بھی بتایا ہے کہ اُن کی قوم کم تولنے اور ڈنڈی مارنے کی عادی تھی اور وہ اِس گمراہ قوم کی اصلاح کے لئے بھیجے گئے تھے۔ اسلامی معاشرے میں محتسب کو یہ فرض سونپا گیا ہے کہ بازاروں میں

جاکر دکانداروں کے ناپ اور تول کے پیمانے چیک کرے اور اگر کسی دکاندار کو کم تولنے یا کم وزن کے باٹ رکھنے کا مرتکب پائے تو اُسے قاضی کی عدالت میں پیش کر کے اسے قرار واقعی سزا دلائے۔ اسلامی معاشرے میں کم تولنا یا ڈنڈی مارنا خدا کے عذاب کو دعوت دینا ہے ❊

اسلامی معاشرے میں امانت کا پاس کرنے، وعدہ ایفاء کرنے اور قرض دیتے وقت دستاویز تیار کرنے پر زور دیا گیا ہے ــــ ارشادِ باری ہے:

یَآاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا تَدَایَنۡتُمۡ بِدَیۡنٍ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکۡتُبُوۡهُ۔

(البقرہ: ۲۸۲) ❊

قرآن جو معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے اُس میں اللہ کے بندوں کو نظریں جھکا کر عاجزی کے ساتھ چلنے کی تلقین کی گئی ہے: وَعِبَادُ الرَّحۡمٰنِ الَّذِیۡنَ یَمۡشُوۡنَ عَلَی الۡاَرۡضِ هَوۡنًا (الفرقان: ۶۳) اور اکڑ کر چلنے کو بُرا گردانا گیا ہے: "وَلَا تَمۡشِ فِی الۡاَرۡضِ مَرَحًا ۚ" (بنی اسرائیل: ۳۷)۔ اللہ کے نیک بندوں کو یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ جب وہ کسی ایسی جگہ سے گزریں جہاں لوگ لغویات میں مشغول ہوں تو وہ بزرگانہ طریقے سے اپنا دامن سمیٹتے ہوئے آگے بڑھ جائیں: وَاِذَا مَرُّوۡا بِاللَّغۡوِ مَرُّوۡا کِرَامًا ؕ (الفرقان: ۷۲)۔ ان کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ جب جاہل اُن پر آوازے کستے ہیں تو وہ اُن کے ساتھ اُلجھ نہیں پڑتے، بلکہ خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ "وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الۡجٰهِلُوۡنَ قَالُوۡا سَلٰمًا ؕ"

قرآن مجید نے کسی کے بارے میں بے جا تجسّس کرنے سے بھی منع فرمایا اور اسی طرح کسی کے بارے میں بدظنی سے بھی بچنے کی تلقین کی ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ بعض اوقات بدظنی بھی گناہ بن جاتی ہے۔ اس ضمن میں ارشادِ باری ہے:

یَآاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اجۡتَنِبُوۡا کَثِیۡرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعۡضَ الظَّنِّ اِثۡمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوۡا (الحجرات: ۱۲)

قرآنی معاشرے میں غیبت کو بہت بُرا جانا گیا ہے اور طعنے دینے والے اور چغلی کھانے والے کے لئے خرابی بتائی گئی ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے موقعہ پر غیبت کرنے والے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھاتا ہے ــــ

(الحجرات : ۱۲)۔ قرآنی معاشرے میں کسی شخص کو بُرے نام سے پکارنے کی بھی ممانعت آئی ہے : ارشادِ باری ہے : وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ط (الحجرات : ۱۱)۔ اسی طرح جو مسلمان اپنے ناموں کے ساتھ ساقی، میکش، صبوحی اور رند وغیرہ کا دُم چھلا لگا لیتے ہیں، اُن کے بارے میں بھی قرآن مجید میں ان الفاظ میں ممانعت آئی ہے :-
بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ——— !! (الحجرات : ۱۱)

اسی طرح قرآن مجید نے لوگوں کو اُن کے باپوں کے نام سے پکارنے کا حکم دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :
اُدْعُوْھُمْ لِاٰبَآئِھِمْ ھُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰہِ ط (الاحزاب : ۵)
——— راقم الحروف نے بڑے بڑے علماء کی تحریروں میں حضرات حسنین رضؓ، حضرت زین العابدینؒ حضرت محمد باقرؒ اور جعفر صادقؒ کے نام کے ساتھ ابنِ رسول اللہ لکھا ہوا دیکھا ہے۔ جو قرآن پاک کی اِس آیت کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ جس میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے : مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ (الاحزاب : ۴۰)
قرآن مجید نے فاسق کی خبر پر بلا سوچے سمجھے اعتبار کر لینے سے منع کیا ہے کیونکہ اِس سے بہت بڑا فتنہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اِس ضمن میں ارشادِ باری ہے :
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌ م بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًا بِجَھَالَۃٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ ۝ (الحجرات : ۶)
قرآن مجید نے صحابہ کرام رضؓ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی آوازوں کو پست رکھنے کا حکم دیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو جن اصحاب کی آوازیں بلند تھیں، اُن میں سے کئی بزرگوں نے از راہِ احتیاط حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہونا چھوڑ دیا تا آنکہ آپؐ نے انہیں تسلی دے کر اپنے حضور میں طلب فرمایا۔ اسلامی معاشرے میں پیغمبر، مرشد اور اُستاد کے احترام کا یہی سبق سکھایا گیا ہے۔ صحابہ کرام رضؓ کو اس بات سے بھی منع کیا گیا تھا کہ جب آنحضرتؐ اپنے کاشانۂ مبارک میں آرام فرما ہوں تو آپؐ کے دروازے پر جا کر آپؐ کو آواز نہ دیں بلکہ آپؐ کے باہر تشریف لانے کا انتظار کریں۔ یہ ہمارا اپنا مشاہدہ ۝

ہے کہ بعض بظاہر پڑھے لکھے لوگ وقت بے وقت ایک دوسرے سے ملنے چلے جاتے ہیں۔ قرآن پاک نے نمازِ فجر سے قبل، دوپہر کے وقت اور عشاء کے بعد بے تکلفی کے ساتھ کسی کے ہاں جانے سے منع کیا ہے، ارشادِ باری ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ (سورۃ النور: ۵۸)

بچوں کو دوسروں کے گھروں میں جانے کی اجازت ہے، لیکن جب بالغ ہو جائیں تو انہیں دوسروں کے گھروں میں اجازت لئے بغیر داخل ہونے کی اجازت نہیں — قرآن مجید بھی بتاتا ہے کہ جب کسی کے گھر جائیں تو سلام کئے بغیر گھر میں داخل نہ ہوں۔

قرآن مجید نے ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے ہتھیانے اور کھانے کی ممانعت کی ہے: وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (البقرہ: ۱۸۸) — اگر کوئی اندھا، لنگڑا، مریض یا کوئی صحت مند شخص اپنے باپ، ماں، بھائی، بہن، چچا، پھوپھی، خالہ یا ماموں کے ہاں سے کھالے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں (النور: ۶۱) فقیر کو کھانا کھلانے کا بڑا ثواب ہے، اور فقیر کو کھانا نہ کھلانے والے کو روزِ جزا کا منکر بتایا گیا ہے: اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ (الماعون ۱ تا ۳)

قرآن مجید نے سود لینے اور کھانے سے منع کیا ہے، کیونکہ اس سے قطع رحمی ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآنی معاشرے میں ایسے جانوروں کا گوشت کھانے کی بھی ممانعت آئی ہے جن کو ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ بتوں کے استھانوں پر جانور لے جا کر ذبح کرنے کی بھی قرآن میں ممانعت آئی ہے۔ اسی سے درگاہوں پر جانور لے جا کر پیروں فقیروں کے نام پر ذبح کرنے کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ مردار جانور اور لحمِ خنزیر کی بھی قرآن مجید میں حرمت آئی ہے۔ راقم الحروف نے یورپ میں نو سالہ قیام کے دوران میں یہی دیکھا ہے کہ جو قومیں خنزیر کا گوشت کھاتی ہیں، اُن میں خنزیر والی جیسی بدخصلتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ قرآن مجید نے مسلمانوں کو خونخواری سے روکنے کے لئے جانوروں کے خون کے استعمال پر بھی پابندی لگائی ہے: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ

وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ (المائدہ:۳) قرآن مجید توہم پرستی کے خلاف ہے، اس لئے اس نے فال نکالنے سے بھی منع کیا ہے۔ ازلام کی حرمت ایسی ہی ہے جیسی لحم خنزیر اور بتوں کے استھانوں پر ذبح کئے ہوئے جانوروں کی ——— !!

قرآن مجید نے شراب اور تمام مُنشّی اشیاء کے استعمال کو حرام قرار دیا ہے۔ موجودہ دور میں بعض "روشن خیال" حضرات برملا یہ کہتے پھرتے ہیں کہ قرآنِ پاک میں شراب کے لئے حرام کا لفظ نہیں آیا، حالانکہ یہ اہلِ زبان کا محاورہ اور قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ اُس نے "فَاجْتَنِبُوْهُ" کہہ کر اُس سے بچنے اور دُور رہنے کا حکم دیا ہے: (المائدہ: ۹۰) قرآن مجید نے شراب نوشی، مُنشّی اشیاء کے استعمال، بُت پرستی اور پانسے پھینکنے کو شیطانی عمل سے تعبیر کیا ہے ٭

بعض "روشن خیال" لوگ مُنشّی اشیاء کے بارے میں یہ کہتے سُنے گئے ہیں کہ اس کی تھوڑی مقدار نشّہ نہیں دیتی، اِس لئے ایک دو گلاس بیئر پی لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ہمارے فقہاءِ کرام کا متفقہ فتویٰ ہے کہ جس چیز کی زیادہ مقدار نشّہ آور ہو اُس کا ایک قطرہ استعمال کرنا بھی حرام ہے۔ اِس عاجز نے یورپ میں قیام کے دوران میں اِس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ جو قومیں شراب اور نشّہ آور اشیاء استعمال نہیں کرتیں، وہ شراب نوش قوموں سے اخلاقی اعتبار سے بہت آگے ہیں۔

قرآنی معاشرے میں شراب نوش کو دُرّے لگانے کا حکم ہے۔ اگر کوئی عادی مجرم بار بار شراب نوشی کا ارتکاب کرے تو ہمارے بزرگوں نے اُس کے لئے جلاوطنی کی سزا بھی تجویز کی ہے ٭

قرآنی معاشرے میں قتلِ ناحق کی بڑی مذمّت آئی ہے۔ قرآن مجید کی نظر میں ایک انسان کا قتل تمام بنی نوعِ آدم کے قتل کے برابر ہے اور ایک انسان کو زندہ کرنا گویا تمام اولادِ آدم کو زندہ کرنے کے مترادف ہے۔ (المائدہ: ۳۲) اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کی ایک خوبی یہ بھی بتائی ہے کہ وہ کسی کو ناحق قتل نہیں کرتے: "وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ" ۔ سیّدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دل میں ایک مسلمان کے خون کا اتنا احترام تھا کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر ایک

مسلم کے خون کے عوض انہیں کوئی تمام دنیا دینے کا وعدہ کرے تو وہ اسے قبول نہیں کریں گے ـــــ سورۃ الفرقان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی ہے کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے : وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ـــــ آج ہمارے معاشرے کی ایک بڑی خرابی یہی ہے کہ عدالتوں میں پیشہ ور گواہ مل جاتے ہیں، جن کی گواہی قبول کرتے ہوئے جج صاحبان نے بہت سے بیگناہوں کو تختۂ دار پر لٹکا دیا ہے۔ قرآن مجید نے جس طرح جھوٹی گواہی دینے سے منع کیا ہے اسی طرح سچی گواہی کو چھپانے کی بھی ممانعت آئی ہے : ارشادِ باری تعالیٰ ہے :ـــ ـــ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ (البقرہ:۲۸۳) لیکن ہم نے بارہا اس کا مشاہدہ کیا ہے کہ جب کوئی گواہ کسی ملزم کے خلاف گواہی دے کر کمرۂ عدالت سے باہر نکلتا ہے تو ملزم کے ساتھی اُسے وہیں ڈھیر کر دیتے ہیں کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ گواہ کو عدالت میں پیش ہونے سے پہلے ہی غائب کر دیا گیا۔ ان حالات میں کون بھلا مانس عدالت میں سچی گواہی دینے کے لئے پیش ہوگا۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ گواہ کی جان و آبرو کی حفاظت کی جائے اور اسلامی معاشرے میں پیشہ ور گواہ کی گواہی قبول نہ کی جائے، جب تک جھوٹے گواہوں پر شریعت کے مطابق حدِّ قذف جاری نہیں ہوتی، اُس وقت تک ہمارا عدالتی نظام صحیح طریقے پر نہیں چل سکتا۔

اسلام میں حُسنِ معاشرت پر بڑا زور دیا گیا ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ اُنہیں صرف اخلاق کی تکمیل کے لئے ہی مبعوث کیا گیا ہے۔ اسلامی معاشرے میں کسی کے ساتھ بداخلاقی سے پیش آنے کی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے : قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا اور دوسرے موقع پر فرمایا:۔ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا (یعنی ہمیشہ سیدھے اور صاف الفاظ میں بات کیا کرو!) قرآن مجید ایسی زبان استعمال کرنے سے روکتا ہے جس سے لوگ صحیح مطلب اخذ نہ کریں۔ سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کو صرف اِس لئے سزا دی تھی کہ اس کی بات سے غلط مطلب بھی اخذ کیا جا سکتا تھا۔

اسی معاشرے میں باطنی امراض کی افزائش کو روکنے کا بھی سدِّباب کیا گیا ہے۔ عورتوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب کوئی مرد گھر میں موجود نہ ہو اور کوئی اجنبی دروازے پر آکر

دستک دے تو اُس سے نرم الفاظ یا لکھنؤ کے شیریں لہجے میں جواب نہ دیں بلکہ ذرا کرخت آواز میں جواب دیں (الاحزاب : ۳۲) تاکہ سننے والے کے دل میں شیطانی وسوسہ پیدا نہ ہو۔ اسی طرح اسلامی معاشرے میں عورتوں کو میک اَپ کرکے، خوشبو لگا کر یا ایسے زیور پہن کر جن سے چھن چھن کی آواز آتی ہو، جو غیر مردوں کو اپنی طرف متوجہ کریں، باہر آنے کی ممانعت ہے ؛

قرآن مجید نے پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانے سے سخت الفاظ میں منع کیا ہے اور ایسا کرنے والے اگر چار گواہ پیش نہ کر سکیں تو اُن کو اسّی دُرّے مارنے کا حکم ہے (النور : ۴) ——— حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں شعراء کو اِس بات سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے کہ وہ اپنے اشعار میں عورتوں کے نام نہ لیں۔ اسلامی معاشرے میں اختر شیرانی کی شاعری کے لئے جس میں عذرا، شیریں سلمیٰ وغیرھنّ کے نام بار بار آتے ہیں، کوئی گنجائش نہیں ہے ؛

احتساب : قرآنی معاشرے میں احتساب پر بڑا زور دیا گیا ہے ن ارشادِ باری تعالیٰ ہے : وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط (آلِ عمران : ۱۰۴) خلفاءِ راشدین بنفسِ نفیس اپنے عوام کا احتساب کرتے رہے اور دورِ ملوکیّت میں عوام کا احتساب کرنے کے لئے باقاعدہ محتسب مقرر کئے گئے۔ فقہاءِ کرام نے محتسب کے فرائض کی بڑی لمبی چوڑی فہرست دی ہے، جن پر عمل کرنے سے ایک معاشرہ صحیح معنوں میں اسلامی معاشرہ بن جاتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں کسی بد کردار دکاندار کو ایسے بازار میں دکانداری کی اجازت نہیں جہاں عورتیں خرید و فروخت کے لئے جاتی ہوں۔ نیم حکیم کو طبابت سے روکا گیا ہے اور لوگوں کو اپنے ملازموں اور جانوروں سے اُن کی ہمّت سے زیادہ کام لینے سے منع کیا گیا ہے۔ محتسب کا یہ فرض ہے کہ بیاہ شادی کے موقعہ پر عورتوں کو گانے بجانے سے روکے اور اُن کے گانے کی آواز مردوں کے کانوں تک نہ پہنچنے پائے۔ محتسب کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ نوجوان واعظوں اور خطیبوں کو عورتوں کی موجودگی میں وعظ اور خطبے کے دوران عشقیہ اشعار پڑھنے سے روکے۔ سچ پوچھیے تو اسلام نے ہر اُس سوراخ کا مُنہ کر دیا ہے جہاں سے بداخلاقی کا فتنہ سر نکال سکتا ہے ؛

قرآن کانفرنس کے نام

احمد حسن البکر صدر جمہوریہ عراق کا پیغام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجمهورية العراقية

رئاسة الجمهورية

الرئيس

الى الاخوة المومنين في جمعية خدام القرآن المركزية

قال الله تعالى (ان هذا القرآن يهدى للتي هي اقوم ويبشر المومنين الذين يعملون الصالحات ان لهم اجرا " كريما ") وقال الله تعالى (وانه لتنزيل رب العالمين نزل به الروح الامين على قلبك لتكون من المومنين بلسان عربي مبين) •

لقد اسعدتني رسالتكم وسرني ماورد فيها عن سعيكم لخدمة القرآن العظيم الذى هو للمومنين هدى وشفاء ، ومبعث سعادة وهناء في الدارين •

ويطيب لي ان ابعث اليكم تحية أخ لكم يبارك جهودكم ويرجو لكم دوام التوفيق في عملكم الموفق ان شاء الله •

ان القرآن المجيد هو الذي نشر في العالم كله اخوة الايمان وجعل من المؤمنين في كل بقاع الارض جسدا" واحدا" اذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى •

وهو الذي انشأ حضارة مجيدة لا تطغي فيها المادة على الروح ولا الروح على المادة ولكن قامت على اساس الايمان بالله وتصديق رسوله صلى الله عليه وسلم وان البشر كلهم اخوة لا فضل لأحد على احد الا بالتقوى والعمل الصالح •

(يا ايها الناس انا خلقناكم من ذكر وانثى وجعلناكم شعوبا" وقبائل لتعارفوا ان اكرمكم عند الله اتقاكم) •

وان العالم اليوم في اشد الحاجة الى رسالة الاسلام ودعوة القرآن لتنقذه من اخطار الحضارة المادية التي تثير بين الافراد والشعوب العداوة والبغضاء والنزاع والحروب •

ان الانسان في كل مكان يحتاج الى ان يصغي الى قول الله تعالى (يا ايها الذين آمنوا اتقوا الله حق تقاته ولا تموتن الا وانتم مسلمون واعتصموا بحبل الله جميعا" ولا تفرقوا واذكروا نعمة الله عليكم اذ كنتم اعداء فألف بين قلوبكم فأصبحتم بنعمته اخوانا) •

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته •

احمد حسن البكر

رئيس الجمهورية العراقية

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان — اور — سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

ہر مسلمان پر

حسب صلاحیت و استعداد

قرآن مجید

کے مندرجہ ذیل پانچ حقوق عائد ہوتے ہیں

① ـــــ ایمان و تعظیم ـــــ یہ کہ اُسے مانے۔

② ـــــ تلاوت و ترتیل ـــــ یہ کہ اُسے پڑھے

③ ـــــ تذکّر و تدبّر ـــــ یہ کہ اُسے سمجھے

④ ـــــ حکم و اقامت ـــــ یہ کہ اُس پر عمل کرے

⑤ ـــــ تبلیغ و تبیین ـــــ یہ کہ اُسے دوسروں تک پہنچائے۔

ان حقوق سے واقفیت اور آگاہی حاصل کرنے کے لیے
جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی شہرۂ آفاق تالیف

"مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق"

کا مطالعہ اِن شاء اللہ العزیز بے حد مفید ہوگا

سلسلہ اشاعت

تنظیم اسلامی

(۱)

قرار داد تاسیس مع توضیحات

قیمت فی نسخہ ۱/۵۰

(۲)

شرائط شمولیت اور نظام العمل

قیمت فی نسخہ . . . . -/۱

(۳)

سرافگندیم

بسم اللہ مجریھا ومرسھا

نظیم اسلامی کے قیام کے فیصلے پر مشتمل ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی
مفصل تقریر جس میں موصوف کی مختصر سرگذشت بھی موجود ہے!
اور ایک اہم مقالہ
مسلمہ کا عروج و زوال اور موجودہ احیائی مساعی کا اجمالی جائزہ"
بھی شامل ہے!

(زیر طبع)

زی مکتبہ تنظیم اسلامی ...

رجسٹرڈ ایل نمبر ۳۶۰

وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۲۸ | مئی ، جون ۱۹۷۹ء | عدد ۵ - ۶

مشمولات

		صفحہ
★ امت مسلمہ کا عروج و زوال اور موجودہ احیائی مساعی کا اجمالی جائزہ	ڈاکٹر اسرار احمد	۱
★ مطالعہ قرآن حکیم : دو نشری تقاریر	ڈاکٹر اسرار احمد	۳۳
★ قرآن حکیم اور تزکیہ نفس	مولانا سید زوار حسین صاحب	
★ اخلاق حسنہ اور قرآن	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	۴۹
★ معاشی معاملات کا قرآنی تصور	مولانا محمد طاسین	۶۷
★ عصر حاضر کے چیلنج کا نعرہ ، اس کی حقیقت اور اس کا جواب	ڈاکٹر برہان احمد فاروقی	۷۹
★ نفاذ شریعت اسلامی اور افراد معاشرہ کی ذمہ داریاں	جناب شیخ حیدر ایڈووکیٹ	۸۱
★ قرآن کا معاشرتی نظام	پروفیسر محمد اسلم	۹۰

ناشر و مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مقام اشاعت : ۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن - لاہور

(فون : 852683 - 852611)

پرنٹر : چوہدری رشید احمد ۔— مطبع : مکتبہ جدید پریس ، شارع فاطمہ جناح لاہور

۲/-